شیلف میں رکھی کتاب

امجد جاوید

شیلف میں رکھی کتاب

امجد جاوید

علم و عرفان پبلشرز

40-الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور

فون 042-7352332-7232336

نوٹ:

وحشتِ ہستی ہے مشکل تو لہو روتے ہیں دل
دل لہو روئیں تو ہوتی ہے کہانی پیدا

نام کتاب	....	شیلف میں رکھی کتاب
مصنف	....	امجد جاوید
ناشر	....	علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہد نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	....	قمر ارشاد
سن اشاعت	....	2012ء
قیمت	....	300 روپے

علم وعرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور
فون:7352332-7232336

انتساب۔!

زندگی میں درپیش کچھ

تجربات کے نام

فہرست

۱۔ خال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۰۷

۲۔ وجہ خاص ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳

۳۔ دھواں میں تحلیل چہرہ ۔۔۔۔۔۔ ۳۲

۴۔ جانور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۲

۵۔ صلیبِ وقت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۰

۶۔ بابا گم؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۲

۷۔ شیلف میں رکھی کتاب ۔۔۔۔ ۷۸

۸۔ ماں جیسی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۱

۹۔ ہار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳۰

خال

”سر جی۔! آپ نے اس لڑکی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ بندہ اسے دیکھ کر آنکھ جھپکنا بھول جائے۔ اس قدر چرب زبان اور شاطر ہے، کوئی کتنا بھی پارسا کیوں نہ ہو، بس اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ جائے۔ وہ تو اسے بھی شیشے میں اُتار لے گی۔ وہاں میرے جیسے بندے کی کیا اوقات ہے بھلا۔“ میرے سامنے میز کے پار بیٹھا وہ نوجوان وقاص اپنی بپتا سنانے کا آغاز کر چکا تھا۔ میں اس کی بات پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ سننے لگا کیونکہ اس کے لہجے میں وہ درد اور المناک کیفیت کا احساس تھا جو کسی بھی ناکام عاشق کا ہوتا ہے۔

آپ شاید یہ سمجھیں کہ میں کوئی ”توگرو“ قسم کو بندہ ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں ایک ایک ناکام صحافی ہوں۔ جو بڑا نہیں، اچھا صحافی بننے کا خواہش مند تھا۔ میں صحافتی سرگرمیوں میں ناکام ہو گیا۔ مگر جنہوں نے مجھ سے قلم پکڑنا سیکھا تھا وہ نہ صرف بڑے بلکہ کامیاب صحافی بن گئے تھے۔ مجھے یہ افسوس بہر حال رہا کہ وہ اچھے صحافی نہ بن سکے۔ کیونکہ ان کے کام ہی کچھ ایسے تھے۔ میں تو ایسے دشمن تلاش کرتا رہا جو مجھے میرے منافق دوستوں سے بچا لیتا۔ میں اس میں بھی ناکام رہا۔ خیر۔ ! سلیم شیخ انہی ”کامیاب“ صحافیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے سامنے ایک تیڑھا مسئلہ آن پڑا۔ وہ اس نوجوان وقاص کا مسئلہ تھا۔ اس کے بارے میں مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ ایک حسین و جمیل، شاطر و طرح دار لڑکی نے پیار و محبت کا ڈھونگ رچا کر اسے لوٹ لیا ہے۔ وہ لڑکی اپنے تعلقات میں اس قدر طاقت ور ہے اب اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ خوف زدہ ہے۔ وہ ان مقامی صحافیوں کے پاس مدد کے لئے آن پہنچا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں سو مجھے بڑے اہتمام سے آفس میں لایا گیا اور اس کو میرے سامنے بٹھا دیا کہ اس کی روداد سنیں اور کوئی حل نکالیں۔ جبکہ میرے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ اس لڑکی سے اتنا خوف زدہ کیوں ہیں؟ یہ سوال ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے وقاص کے سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے سوال کیا۔

”تم اگر اس لڑکی کا برا نہیں چاہتے، اس کے ساتھ مخلص ہو تو پھر کیا چاہتے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں، سوائے اس دولت کے جو لڑکی نے مجھ سے ہتھیا لی ہے۔ میں تو لٹ گیا ہوں۔ برباد ہو گیا ہوں۔ میرے پلے تو اب کچھ بھی نہیں رہا۔ میں تو اب کوئی کاروبار کرنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ چار سال تک کویت میں رہ کر جو پونجی کمائی تھی وہ لے اُڑی۔“ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”تم اتنے ہی بے وقوف تھے کہ اس پر اپنی ساری پونجی لٹا دی۔ پاگل تھے کیا تم؟“ میں نے کافی حد تک درشت لہجے میں پوچھا۔ میرے یوں پوچھنے پر یقیناً اس کی نگاہوں میں اس لڑکی کا سراپا لہرایا ہوگا۔ وہ خیالوں ہی میں ٹھٹک گیا پھر لمحہ بعد تیزی سے بولا۔

”سر جی، عرض کیا ہے نا، وہ حسین ہی اس قدر ہے کہ بندہ اس کے سامنے جاتا ہے نا تو سمجھو پاگل ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ کیا۔۔۔ وہ

تو۔۔۔وہ تو۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''تو وہ کیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو بالکل ویسی ہے، جیسے میرے خوابوں کی شہزادی ہے۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کے حسن ہی کا ہو کے رہ گیا۔ میری باقاعدہ منگنی ہو گئی تھی اس کے ساتھ۔ میں سر جی آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔'' اس نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ ''وہ جب میں کویت سے آیا تو میں نے پہلی بار اسے اپنی کزن کی شادی میں دیکھا۔ سر جی وہ کیا شے لگ رہی تھی۔ یہ اونچا لمبا سرو کے جیسا اس کا قد، گہرے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اس نے، جس پر سنہری کام تھا۔ لباس ایسا تھا کہ جس سے اس کا گورا بدن چھلک ہی رہا تھا۔ جسم کا ایک ایک خم نمایاں تھا۔ میں تو دور ہی سے دیکھ کر چونک گیا۔ اتنے خوبصورت بدن والی لڑکی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے کھلے ہوئے گیسو کمر سے بھی نیچے تک جھول رہے تھے۔ میں کویت میں رنگ رنگ کا حسن دیکھ کر آیا ہوں۔ مگر جو بات اس میں ہے نا، کسی اور میں نہیں ہے۔ اسے یوں دیکھ کر شدت سے اُس کا چہرہ دیکھنے کی خواہش میرے دل میں مچلنے لگی تھی۔ اور پھر سر جی، میں دل کڑا کر کے اس کے سامنے جا پہنچا، تب تو پھر میرے ویسے ہی ہوش گم ہو گئے۔ کیا نین نقش تھے اس کے، میں تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جی کہتے ہیں نا کہ پہلی نظر میں محبت ہو جاتی ہے۔ بس مجھے وہ ہو گئی۔ میرے تو دن رات کا چین لٹ گیا۔ میں نے چند دن بعد ہی اپنے والدین سے کہہ دیا کہ مجھے تو بس یہی رخسانہ ہی چاہیے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی بات میں وقفہ دیا۔ جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''اچھا تو اس کا نام رخسانہ ہے، کون ہے وہ؟'' میں نے اس کی ساری سراپا نگاری کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ فوراً گویا ہوا۔

''وہ جی، یہ جو چمن نگر ہے۔ وہاں کا جو بنیادی مرکز صحت ہے۔ وہ اس میں ایل ایچ وی ہے۔''

''بس ایک ایل ایچ وی سے ڈرے ہوئے ہو، ارے وہ تو ایک درخواست کی مار ہے۔'' میں نے شیخ سلیم کی طرف دیکھ کر افسوس سے کہا۔ پھر سامنے پڑے ہوئے ٹیلی فون کا ریسور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ایک فون کرتا ہوں ضلعی آفیسر کو، اور وہ۔۔۔'' میں نے کہنا چاہا تو وہ نوجوان تیزی سے بولا۔

''خدا کے لیئے۔ ایسا مت کریں سر جی۔ پہلے آپ میری پوری بات سنیں۔'' اس کے یوں کہنے پر میں نے ریسور رکھ دیا اور پھر سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ ''اس کے تعلقات پتہ نہیں کہاں کہاں تک ہیں سر جی۔ میرا خیال ہے آپ اب خبروں پر نگاہ نہیں رکھتے۔ شیخ صاحب آپ ہی بتائیں۔''

''وہ پچھلے دنوں وہیں چمن نگر میں اس نے ایک ڈاکٹر کو تھپڑ مار دیا اور پھر اس ڈاکٹر کے خلاف اس نے جلوس بھی نکلوا دیا۔ اس ڈاکٹر کی تو وہ درگت بنی کہ اسے وہاں سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔ کافی عرصہ معطل رہنے کے بعد اب بحال ہوا ہے۔ وہ چمن نگر ہی نہیں یہ ضلع ہی چھوڑ گیا ہے۔''

''یار ایسی بلا شے کون ہے؟'' میں حیران رہ گیا۔

'' وہ ایسی ہی ہے سر جی، وہ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ بس حسن کا ایک شاہکار مجسمہ ہے۔ اس کے پیچھے بہت سارے بے غیرت قسم کے دلال

نما لوگ ہیں۔ کچھ سامنے ہیں اور کچھ اپنی سازشوں میں اس لڑکی کا استعمال کرتے ہیں۔ میں بھی ایسی ہی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔ کسی نیچ اور گھٹیا بندے کو میری کویت سے لائی ہوئی دولت نہیں بھائی۔ مجھے جو علاقے میں عزت اور شہرت ملی ہے وہ انہیں برداشت ہی نہیں ہوئی۔ ایسے حسد کے مارے لوگ مختلف ہتھکنڈوں، حیلوں اور بہانوں سے سازش کر کے اپنے دل کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ایسا ہوتا نہیں، ان کی یہ آگ بڑھ جاتی ہے۔" اس نے حد درجہ جذباتی ہوتے ہوئے کہا

"ہاں یار مجھے تمہاری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔" میں نے ہمدردی سے کہا پھر سلیم شیخ سے پوچھا "کیوں، تمہیں کیا لگتا ہے، وہ کوئی گینگ وغیرہ تو نہیں ہے؟"

"اسے ہی تو سمجھنا ہے کہ ایسا ہے بھی یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو۔۔۔" اس نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ میرے سے مسکرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تب میں نے وقاص سے پوچھا

"اچھا، یہ بتاؤ، منگنی کیسے ہو گئی تمہاری؟"

"بس میری غلطی کا آغاز تو یہیں سے ہوا ہے نا سر جی، میں نے اپنے والدین سے بات کی۔ وہ بہت مشکل سے مانے، کیونکہ ان کی ذات برادری الگ ہے اور ہماری الگ۔ میں نے ہر طرح کا دباؤ دے کر اپنے والدین کو منا لیا۔ انہوں نے درمیان میں کچھ لوگ ڈالے، ان کی مرضی معلوم کی اور پھر ان کے ہاں جا پہنچے۔ دو چار دفعہ آنے جانے سے اور ایک ہی مقصد ہونے کی وجہ سے وہ لوگ مان گئے۔ بس اس طرح منگنی ہو گئی۔ پھر وہ جو اجنبیت کی جھجک تھی، وہ ختم ہو گئی۔ ہم گاہے بگاہے ملتے رہے۔ انہی ملاقاتوں میں وہ پہلے پہل تو دور دور رہتی رہی۔ لیکن پھر ہر ملاقات میں وہ ایک الگ سا نشہ دیتی رہی۔ وہ مجھ پر اس طرح خمار طاری کر دیتی کہ مجھے اپنا ہوش ہی نہ رہتا۔" وہ اپنی رَو میں کہتا چلا گیا۔

"مطلب تم شادی سے پہلے ہی۔۔۔؟" میں نے چونک کر پوچھا

"نہیں نہیں سر جی، اس کے حسن کا سحر، اس کے لمس کا خمار، اس کی باتوں کا جادو، آئندہ آنے والے دنوں کے خواب کچھ ایسے رنگین ہوتے تھے کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے مطالبات بڑھتے چلے گئے۔" اس نے اپنی بات میں زور دیتے ہوئے کہا

"کیا مطالبات تھے اس کے؟" میں نے پوچھا

"یہی کہ اگر شادی جلدی کرنی ہے تو پہلے میرے جہیز کا سامان بنا دو۔ ہر شے میں اپنی مرضی کی خود خریدوں گی۔ میں اسے رقم دیتا رہا۔ میں اب سوچتا ہوں، وہ شاطر ایسی تھی کہ کہیں بھی رقم لینے دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔" وہ تیزی سے بولا

"خیر قصہ کوتاہ یہ ہے کہ وہ شاطر، تعلقات والی طاقت ور حسینہ تمہیں لوٹ چکی ہے اور اب تم اس سے اپنی رقم واپس لینا چاہتے ہو، بس یہی بات ہے نا؟" میں نے بات کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"سر جی، اگر تو وہ رقم واپس کر دیتی ہے اور تعلق نہیں رکھنا چاہتی، تو بھی ٹھیک ہے۔ اگر وہ شادی کر لینے پر راضی ہو جاتی ہے تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ اس طرح کم از کم علاقے میں میری عزت ہی رہ جائے گی۔" آخر کار اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''اور اگر وہ ان باتوں پر بھی راضی نہیں ہوتی تو پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے پوچھا

''تو پھر کم از کم اس کا یہاں سے تبادلہ کہیں دُور ہو جائے۔'' اس نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کرنا چاہیے؟ میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ میری سوچ جدھر بھی جاتی، وہیں سے ناکام لوٹ آتی۔ میں کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا کہ یہ معاملہ بخیر وخوبی حل ہو جائے۔ تب اچانک میرے ذہن میں خیال آ گیا تو میں نے کہا۔

''یار کیوں نا میں اس سے سیدھے سبھاؤ جا کر ملوں اور اس سے بات کروں؟''

''دیکھ لیں، جو آپ بہتر سمجھیں۔'' وقاص نے تیزی سے کہا تو نجانے مجھے یہ شک کیوں گزرا کہ ممکن ہے یہ ہمارے ہی خلاف کوئی سازش تو نہیں ہے۔

''ہم وہاں جائیں گے کیسے؟'' سلیم اپنے مطلب کی بات پر اُتر آیا۔

''باہر کار کھڑی ہے۔ میں آپ کو لے جاتا ہوں۔ پر میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ آپ اگر اس پر ہاتھ ڈالو تو بہت مضبوطی سے، سانپ پکڑنے کے لئے بڑا محتاط ہونا پڑتا ہے۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا

''میں تمہارا مشورہ ذہن میں رکھوں گا۔ سلیم یار ٹیم تیار کرو۔'' میں نے کہا اور چمن نگر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ٹیم تیار کرنے کا مطلب تھا کہ اخبار والوں نے اچانک اس بنیادی مرکزِ صحت پر چھاپہ مارا ہے۔ جہاں رعب داب پڑتا، وہاں سلیم کی دیہاڑی کھری ہونے والی تھی۔ مگر مجھے اس کوئی سروکار نہیں تھا۔

چھ بندے، چمن نگر کی جانب چل پڑے۔ اندازے کے مطابق وہ کوئی آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔ اس دوران وقاص مجھے اس لڑکی کے بارے میں بہت ساری باتیں سناتا چلا گیا۔ جو اسے گاہے بگاہے معلوم ہوتی رہیں۔ جس ڈاکٹر کے خلاف اس نے جلوس نکلوایا تھا۔ اس سے پہلے ایک ڈاکٹر کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھاتی رہیں۔ جب اسے اچھی طرح نچوڑ لیا تو بلیک میل کرنے لگی۔ وہ بندہ خدا اس سے سچ مچ کا عشق کرنے لگ گیا تھا۔ وہ ذلیل وخوار ہو کر یہاں سے نکلا، وہ ایسا یہاں سے ایسا گیا کہ اس نے نہ صرف نوکری چھوڑ دی، بلکہ وہ نشے کی لت میں بھی مبتلا ہو گیا۔ رخسانہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنی حفاظت کے لیے چند غنڈے بھی رکھ چھوڑے ہیں، جو عموماً اس کے پاس ہی رہتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی اور کئی باتیں مجھے وقاص نے سنائیں۔ جیسے ہی ہم چمن نگر کے باہر پہنچے تو نوجوان نے گاڑی روک دی۔ تب میں نے پوچھا

''کیا ہوا، گاڑی کیوں روک دی؟''

''آپ جائیں، میں یہیں رکوں گا۔ ظاہر ہے میں ساتھ ہوا تو وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے بھیجا ہے۔ اسے تو بھنک بھی نہیں ملنی چاہیے۔'' وقاص نے کہا تو مجھے اس کی بات نہایت معقول لگی۔ تب میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو؟''

"میں یہیں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ وہ نہر کنارے ایک چھوٹا سے ہوٹل تھا۔ جس کے باہر چار پائیاں اور لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئیں تھیں۔ میں نے اس منظر میں زیادہ دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ ایک دوسرے لڑکے نے سٹیرنگ سنبھال کر گاڑی بڑھا دی تھی۔

جب میں چمن نگر کے بنیادی مرکز صحت کے اندر گاڑی میں سے اترا تو میرے ذہن میں رخسانہ کا تصور ایک عیاش، شاطر اور خود غرض لڑکی کے طور پر بن چکا تھا، جو اپنی خواہش کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ ایسی عورت کو میں سبق سکھانا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اسے سبق سکھانے میں میری خواہش بھی شامل ہو گئی تھی۔ مجھے ان بے غیرت اور گھٹیا مردوں پر زیادہ غصہ آ رہا تھا کہ جو ایسی عورتوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

میں گاڑی سے نکل کر سیدھا ڈاکٹر کے کمرے میں چلا گیا اور باقی ٹیم ارد گرد پھیل گئی۔ تاکہ وہ یہ کاروائی ڈال سکیں کہ کتنے ملازمین حاضر ہیں۔ کیا ہوا ہے، اور کہاں کہاں خامی ہے۔ جسے وہ ان کی کمزوری بنا سکیں۔ ایک شریف سا، خشخشی داڑھی والا، لمبے قد کا ڈاکٹر کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی مریض نہیں تھا، میز پر مختلف چیزیں تھیں، وہ مجھے اندر آتا ہوا دیکھ چکا تھا، میں نے دبنگ انداز میں سلام کیا اور بڑے کروفر سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جی فرمائیں۔!" وہ انتہائی تمیز سے بولا تو میں نے اپنا تعارف بڑے ٹھنڈے لیکن دھانسو انداز میں کروایا۔ تب وہ چونک گیا اور کسی حد تک حواس باختہ ہو کر پریشان بھی ہو گیا۔ ظاہر ہے بیٹھے بٹھائے اخبار والے ان پر غضب کی طرح نازل ہو گئے تھے۔ پھر ایسا چھوٹا اسٹیشن جو پہلے ہی خبروں کی زد میں تھا۔ میں نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں، بلکہ اسے لے کر دفتر سے باہر آ گیا اور اپنے انداز میں سوال پر سوال کرنے لگا۔ میرا مقصد رخسانہ کے کمرے تک پہنچنا تھا اور کسی بہانے وہاں رُک کے اس سے گفتگو کرنا تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے دفتر میں تھا اور وہ میرے سامنے تھی۔ میں چونکا نہیں۔ بلکہ مجھے چونکنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ حجاب میں تھی اور بڑی ساری چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔

"یہ ہیں جی، مس رخسانہ، یہاں ایل ایچ وی ہیں۔ بہت ہی محنتی اور تجربہ کار اور پابند وقت ہیں۔ علاقے کی عوام ان کے کام سے بہت خوش ہیں۔" ڈاکٹر نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کا تعارف کرایا تو میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر رخسانہ کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ کر کچھ دیر آپ سے باتیں کر سکتا ہوں؟"

"جی کیوں نہیں، تشریف رکھیں" اس نے کہا، یقیناً اسے میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ تبھی ڈاکٹر واپس مڑتے ہوئے بولا۔

"سر جی، آپ یہاں سے فارغ ہو جائیں تو دفتر میں تشریف لے آیئے گا، چائے ادھر ہی پیئں گے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رخسانہ کی طرف دیکھنے لگا جو ستی سادہ تری بنی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ بلاشبہ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں۔ گورے رنگ میں گلابی پن کی جھلک تھی، گلابی آمیزش والے گورے رنگ پر سیاہ آنکھیں تو خوبصورت تھیں ہی، لیکن ان میں من موہنی آنکھوں کا دیکھنے انداز اپنی جگہ پر کشش اور منفرد تھا۔ تجسس بھری سوال کرتی، کچھ بھی بے باک نگاہیں۔ اس نے اپنا نقاب جس ہاتھ سے روکا ہوا تھا۔ وہ مرمریں ہاتھ شفاف تھا، لانبی لانبی انگلیوں کے ساتھ گول گلابی کلائی، صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میز کی دوسری جانب بیٹھی وہ میری لب کشائی کی منتظر تھی۔ میں نے پاس کھڑی دائی کی طرف

دیکھا، جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ وہاں سے چلی جائے میں اس کی غیر موجودگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری نظروں کا مفہوم سمجھ کر وہ بولی۔

"آپ بلا جھجک بات کریں، جو بھی آپ کہنا چاہتے ہیں؟"

"دیکھیں، میں تمہید میں اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ آج اگر ہم اس بنیادی مرکز صحت میں آئے ہیں اس کی وجہ صرف آپ ہیں۔"

"میں ۔۔۔ وہ کیوں؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں چونکتے ہوئے کہا۔ تو میں بڑے پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

"آپ کے بارے میں کافی ساری شکایات ہمیں ملی ہیں۔ جس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ آپ یہاں کی کرتا دھرتا ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی ڈاکٹر بھی آپ کی مرضی کے خلاف یہاں نہیں ٹک سکتا۔"

"آپ سے کسی نے مذاق کیا ہوگا" اس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پر اعتماد لہجے میں کہا۔ یقیناً یہ کہتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی بھی ہوگی کیونکہ اس کی آنکھیں یہی بتا رہی تھیں۔

"آپ کے خیال میں میرے ساتھ کوئی مذاق کیوں کرے گا؟ اور ۔۔۔۔" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے اسی اعتماد سے بولی۔

"کیونکہ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ یہ میں اس لیے بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے فقط سنا ہوگا اور پھر یہ سوال آپ بغیر کسی تحقیق کے مجھ سے کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہاں تحقیق کر لیتے، جو بہر حال آپ کا فرض بنتا تھا۔ تو آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور یہاں اپنی ڈیوٹی پوری دیانتداری سے دے رہی ہوں۔ ہاں اگر میرے بارے میں کسی کو کوئی شکایت ہے تو بتائیں۔"

"کوئی اگر بتاتا بھی ہے تو آپ کے خلاف کوئی محکمانہ کاروائی نہیں ہوتی، جس کی وجہ آپ کے تعلقات ہیں۔ جیسے کہ پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر ۔۔۔"

"سر! اگر آپ کے پاس میری کوئی شکایت نہیں ہے تو پلیز وقت ضائع نہ کریں۔ رہی اس ڈاکٹر کی بات، وہ مسیحا نہیں، بھیڑیا تھا اور اس کے ساتھ جو بھی سلوک ہوا۔ وہ بہت تھوڑا تھا۔ اور جہاں تک تعلقات کی بات ہے تو کاش میں اتنی طاقت ور ہوتی۔ پھر بتاتی۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر تیزی سے بولی۔ "یا پھر اگر کوئی کسی قسم کی انتقامی کاروائی آپ لوگ کرنا چاہتے ہیں تو وہ ایک الگ بات ہے۔" اس کے لہجے سے بغاوت چھلک رہی تھی۔

"یہ آپ کو ایسا کیوں لگا کہ میں آپ کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے اس کی اکتائی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

"اس لیے سر، کہ میں نے اب تک یہاں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دیانت داری سے خدمت کی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی مریض یہاں آیا ہو اور وہ مجھ سے ناراض ہو کر گیا ہو۔ آپ کا لہجہ اور انداز بتا رہا ہے کہ بات وہ نہیں جو آپ کر رہے ہیں۔" اس نے تیز اور تیکھے لہجے میں بے اعتنائی سے کہا تو میں سمجھ گیا، اس نے کتنی خوبصورتی سے پتہ استعمال کیا ہے اس نے صاف انداز میں اپنے آپ کو دیانت دار اور خدمت گزار بتا کر ایک طرف کر لیا اور یہی باور کرایا کہ اس پر کسی اور ہی وجہ سے الزام تراشی کی جا رہی ہے اور یہ اس کے خلاف انتقامی کاروائی ہے۔ یہ وہ

لمحات تھے جب مجھے صاف بات کہنے کے لیے تمہید باندھنا پڑی۔

"دیکھو بی بی۔ ا جب کسی پر کرپشن ثابت کرنی ہو تو اس کے ہزار راستے ہیں۔ لیکن اگر ضلعی آفیسر آپ کا تبادلہ کسی دور دراز علاقے میں کر دے تو یہ بعد کی بات ہے کہ آپ اپنے تعلقات آزمائیں گی، کیا خیال ہے؟"

"یہی ایک میری کمزوری ہے، جس کے باعث مجھے بلیک میل کیا جاتا ہے لیکن جس قدر مجھے زچ کیا جاتا ہے، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر میرا تبادلہ ہوا تو میں نوکری چھوڑ دوں گی۔"

"اس لیے کہ آپ نے بہت زیادہ مال و دولت جمع کر لی ہے۔۔۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ تنک کر بولی۔

"سر۔! میں جب آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کھل کر بات کریں تو آپ کیوں جھجک رہے ہیں۔ بولیں کس نے بھیجا ہے آپ کو؟" اس کا انداز جارحانہ تھا اس نے کچھ اس طرح طنزیہ انداز میں کہا کہ مجھے ایک لمحہ کو تپش محسوس ہوئی۔

"یہی کہ پہلے ڈاکٹر، اور پھر دوسری پلٹ کو لوٹنے کے بعد۔۔۔" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گئی، آپ کو کس نے بھیجا ہے۔ آپ تو وہ سارے الزامات مجھے بتائیں گے ہی۔ لیکن اس سے پہلے میں وہ سارے الزامات آپ کو بتا دیتی ہوں جو وہ لوگوں کے سامنے مجھ پر لگاتا پھرتا ہے۔ سنیں، میں آپ کو سناتی ہوں۔ لیکن میں پہلے آپ کو بتاتی ہوں کہ میرا تبادلہ میری کمزوری کیوں ہے؟" وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ اس دوران اسے ہوش ہی نہ رہا کہ اس کا نقاب گر گیا ہے اور اس نقاب میں چھپا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح طلوع ہو گیا۔ شفاف سفید اور گلابی چہرہ۔ ستواں ناک، رسیلے بھرے بھرے پتلے لب، گوشت بھری ٹھوڑی اور رخسار تو یوں تھے، جیسے دو قاشیں چہرے پر سی دی گئی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی اس کے حسن سے مبہوت رہ گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں اس کے ہنر کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس نے نقاب اتارنے کا لمحہ کیا خوب چنا ہے۔ وہ مجھے بھی اپنے رعب حسن میں لپیٹ لینا چاہتی تھی۔ جیسے کوئی مکڑی اپنے جال میں پھانسنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ میری توجہ ہٹ گئی تھی جس میں وہ بلاشبہ کامیاب ہو گئی تھی۔ مجھے اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑا۔

"سر جی، میرے دونوں والدین بوڑھے ہو چکے ہیں۔ دونوں بیمار ہیں، بہت مشقت کر لی انہوں نے۔ میں ان کی دیکھ بھال کے لئے یہاں سے قطعاً کہیں نہیں جا سکتی۔ میرا چھوٹا بھائی پڑھ رہا ہے۔ میرا تبادلہ اگر ہو جاتا ہے تو اسے گھر واپس آنا پڑے گا۔ اس کی پڑھائی ختم ہو کر رہ جائے گی، وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں ہے۔ میں اپنے گھر اور بھائی کے تعلیمی اخراجات خود برداشت کر رہی ہوں۔ کیونکہ میں ہی اپنے گھر کی واحد کفیل ہوں۔ نہ میں نوکری ختم کر سکتی ہوں اور نہ تبادلہ ہو جانا برداشت کر سکتی ہوں۔ اور میری یہی کمزوری ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔"

"میں نے تمہارے حالات سن لیے لیکن وہ جو الزامات لگا رہا ہے اس میں کوئی تو سچائی ہو گی۔ ایویں تو کسی پر کوئی الزام نہیں لگا دیتا" میں نے تیزی سے کہا

"نہیں، بہت سارے بے غیرت اور سازشی لوگ ایسے ہیں جو خواہ مخواہ الزام لگا دیتے ہیں۔ جو سر اسران کی اپنی ذاتی وجہ ہوتی ہے اور۔۔۔"

''کیا یہ سچ نہیں کہ آپ کی اس سے منگنی ہوگئی تھی اور منگنی کی آڑ میں تم نے اس کی دولت ہتھیالی۔''

''جھوٹ نہیں، منگنی نہیں ہوئی تھی۔اس نے فقط اپنے والدین کو میرے گھر بھیجا تھا۔میرے گھر والوں نے سوچنے کے لئے کچھ وقت مانگا، جاتے ہوئے روایت کے مطابق اس کی والدہ میرے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ تھما گئی۔وہی پانچ نوٹ انکار کے ساتھ انہیں واپس بھجوا دیا گیا۔وہ جو بندہ واپس دے کر آیا تھا، وہ آج بھی موجود ہے۔یہی دولت تھی جسے آپ جو مرضی رنگ دے دیں۔ان کی ذات الگ تھی اور ہماری الگ، بات آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔''

''اس کا دعویٰ ہے کہ تم نے اس کے ساتھ بہت زیادہ وقت گذارا ہے''

''سر یہ الزام نہیں، تہمت ہے۔میری اس سے یونہی ایک بار ہسپتال میں ملاقات ہوئی ہے۔وہ کسی مریضہ کے ساتھ آیا تھا''۔وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔مجھے لگا کہ بہت اچھی اداکارہ بھی ہے۔

''اس مطلب ہے، آپ ہر الزام سے خود کو بری الذمہ قرار دے رہی ہیں۔ویسے اس ڈاکٹر کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا''میرے یوں کہنے پر اس نے میری طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اعتماد سے بولی۔

''دیکھیں۔!میں نہیں جانتی کہ میں کس قدر حسین ہوں۔لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اپنی حفاظت خود کی ہے۔میں اپنی غربت کے ساتھ لڑی ہوں اور لڑ رہی ہوں میں نے اسی جگہ، جس گھر میں لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھا ہے لیکن کسی کی جرات نہیں تھی کہ میری طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔وہ ڈاکٹر شادی شدہ ہو کر مجھ سے عشق فرمانے لگا تھا۔میں نے اسے احساس دلایا کہ تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔لیکن وہ نہیں سمجھا، پھر میں نے اسے سمجھا دیا۔کیا اپنے کردار کی حفاظت کرنا اب جرم ہے آپ کے معاشرے میں۔اگر یہ جرم ہے تو میں نے یہ جرم کیا ہے۔میرے پاس کچھ اور ہو نہ ہو ایک صاف اور شفاف کردار ہے اور وہ دوحئ پلٹ، اپنی دولت کا زعم دکھاتا ہے مجھے۔اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میرا تبادلہ کروا دے گا۔۔کیونکہ اسے میری کمزوری کا پتہ ہے۔''وہ حد درجہ جذباتی ہوگئی تھی۔اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا وہ تیزی سے بولی۔''اچھا ہوا آپ یہ بات کہنے یہاں تک آگئے ہیں۔ورنہ مجھے کوئی اور راستہ تلاش کرنا پڑتا۔میں آپ سے فقط اتنا کہتی ہوں آپ پوری ایمانداری سے ان الزامات کی تحقیق کریں۔اگر میں غلط ثابت ہوئی تو جو آپ کا جو حکم ہوگا میں اسے مانوں گی۔جو سزا دینا چاہیں، میں بھگتوں گی۔لیکن اگر یہ سچ ثابت نہ ہوا تو پھر آپ کو میری ماننا ہوگی۔اور مجھے یقین ہے کہ آپ ظلم نہیں کریں گے۔۔''

اس کی بات سن کر میرے پاس کسی بھی قسم کے کسی سوال کی گنجائش نہیں رہی تھی۔کوئی سوال کرتا بھی تو وہ محض کج بحثی ہوتی یا پھر اپنی شکست کا واضح اعتراف ہوتا۔میں چند لمحے سوچتا رہا پھر اٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔میں پھر آؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گی۔اور آپ جو حکم دیں گے، میں مان لوں گی۔''اس نے حتمی انداز میں کہا۔میں نے اس کی طرف بھرپور نگاہ سے دیکھا، اس کے چہرے پر حزن پھیلا ہوا تھا، وہ بھیگا ہوا چہرہ عجیب کشش لیے ہوئے تھا۔حسن ہو اور وہ بھی حزنیہ کیفیت میں تو وہ خواہ مخواہ میں الوہی لگتا

ہے۔میں خود پر جبر کرتا ہوا اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

بنیادی مرکز صحت سے باہر نکلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں ایک ہارا ہوا جواری ہوں۔جو میز پر ایک لڑکی کے سامنے اپنے سارے پتے ہار گیا ہے۔اب صرف جھوٹ اور سچ کا نتارا کرنا تھا۔ظاہر ہے گیند اب میرے کورٹ میں تھی، مجھے پوری تحقیق کرنا تھی۔لیکن یہ سب ہوتا کیسے؟میں اس فکر میں مبتلا ہو گیا۔مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ میں رخسار کا چہرہ بھی نہیں پڑھ سکا۔وقتی طور پر اس نے مجھے مطمئن کر کے واپس بھیج دیا تھا جیسے چھوٹے بچے کے ہاتھ میں کھلونا تھما کر وقتی طور پر بہلا دیا جائے۔مجھے اپنی ہزیمت کا احساس ہوا تو خود پر غصہ آنے لگا۔میں اسی کیفیت میں جب گاڑی میں بیٹھا تو سلیم نے جلدی سے پوچھا۔

''کیا بنا قابو میں آئی یا پھر آپ بھی وہیں دل ہار آئیں ہیں۔''اس کے یوں فضول ریمارکس دینے پر جب میں نے گھور کر دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''آپ کے چہرے پر جو بارہ بجے ہیں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''نہیں یار۔ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔''میں نے صاف گوئی سے کہا

''مطلب۔آپ پر بھی اس کا جادو چل گیا۔''وہ سر ہلاتے ہوئے بولا

''بکواس نہیں کرو، مجھے کچھ سوچنے دو۔ابھی راستے میں وہ بھی انتظار کر رہا ہوگا۔''میں نے کہا تو گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

وہ پل کے پاس سڑک کنارے ہمارے ہی انتظار میں کھڑا تھا۔میں گاڑی سے نکلا تو وہ مجھے لے کر ان چارپائیوں کی جانب بڑھ گیا جو نہر کنارے شیشم کے گھنے درختوں کے نیچے دھری ہوئی تھیں۔جب تک دوسرے گاڑی پارک کر کے آئے، کھانا بھی چن دیا گیا۔میں بہت الجھا ہوا تھا۔سامنے رزق پا کر بھی بھوک نہیں جاگی تھی۔اک شکست کا احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا اور سچائی کو سامنے لانے کی فکر مجھے ستائے جا رہی تھی۔

''کیسا رہا؟''اس نے پوچھا، تو اسی لمحے میرے دماغ میں ایک بات اتر آئی۔وہ ایک ایسا نکتہ تھا، لمحوں میں ساری وضاحت ہو سکتی تھی۔میں کافی حد تک پر سکون ہو گیا اور بڑے مزے سے کہا۔

''یار۔!اس کا حسن تو دیکھنے والا ہے۔یقین جانو، جس طرح تم نے بتایا تھا، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

''کیا بتاؤں جناب۔!یہ اس کا حسن ہی تو ہے، جس نے میری دن رات کی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔''وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا

''تمہارا ہی حوصلہ ہے یار، جو تم اس کے ساتھ اتنا وقت گذار لیتے تھے۔میں تو کچھ دیر ہی میں بھوڈ ہیر ہو گیا ہوں۔''یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اور مزہ لیتے ہوئے انتہائی سوقیانہ انداز میں کہا۔''یار وہ کیا شعر ہے، غلط ہے کہ درست، اب میں سمجھا ہوں تیرے رخسار پر تل کا مقصد، دولت حسن پر دربان بٹھا رکھا ہے۔یار وہ جو اس کے اوپری ہونٹ پر دائیں جانب سیاہ تل ہے نا، سرخ ہونٹوں پر سیاہ تل، اس نے تو مجھے لوٹ ہی لیا ہے یار۔۔۔''

''اُو سر جی، اسی تل نے ہی تو ہماری جان نکالی ہوئی ہے۔''وہ خیالوں میں گم ہوتے ہوئے بولا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا اور کوئی بات نہیں کی۔جب ہم کھانا کھا چکے اور میں ٹھنڈا سوڈا حلق سے اتار رہا تھا تو وہ بولا

''اب ہماری قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے سرجی، تبادلہ ہوگا، یا مجھ سے شادی کرے گی۔۔۔''

''یہ دونوں باتیں نہیں ہوں گی'' میں نے سکون سے کہا

''کیا مطلب، پھر کیا رقم واپس کرے گی وہ۔''

''کون سی رقم، جب تم نے اسے کوئی رقم دی ہی نہیں تو مطالبہ کیسا۔ تم جھوٹ بولتے ہو اور میرا مشورہ یہی ہے کہ آئندہ اسے تنگ مت کرنا۔ ورنہ میں بھی تمہارے خلاف ہو جاؤں گا۔ اسے اپنے حال میں جینے دو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ شدت حیرت سے بولا۔

''وہی جو سچ ہے۔ تم سراسر اس پر الزام لگا رہے ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ جو وہ کہہ رہی ہے ٹھیک ہے۔ مثلاً تم نے اس کا چہرہ ہی نہیں دیکھا اور اس کے ساتھ وقت گذارنے کی باتیں کرتے ہو؟'' میں نے اُکتاتے ہوئے کہا

''آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے؟'' وہ غصے میں بولا

''یہ کہ اس کے چہرے پر سرے سے کوئی تل ہی نہیں ہے۔ تمہیں اتنا تو پتہ نہیں اور تہمت لگانے چل دیئے ہو۔'' میں نے سکون سے کہا تو اس نے ندامت سے میری طرف دیکھا اور چارپائی سے اُٹھ کر گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

❀❀❀

وجہ خاص

میں جس فلیٹ میں رہتا تھا اس کی بلڈنگ کے مکیں کئی دنوں سے مجھے ایسی عجیب نظروں سے گھور رہے تھے، جسے میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ میں حال ہی میں وہاں شفٹ ہوا تھا۔ چند لوگوں کو جانتا بھی تھا لیکن ان سے میل جول نہیں تھا۔ مجھے اپنے کام سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ ان سے تعلق بڑھاتا۔ کھانا میں باہر ہی سے کھا کر آتا۔ آتے ہی میں اپنے کام میں مصروف ہو جاتا اور اس وقت تک بیڈ پر نہیں جاتا تھا جب تک اپنا کام ختم نہ کر لیتا۔ بس یہی ایک عادت اچھی تھی۔ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا تھا۔ تب حالت یہ ہو جاتی کہ دماغ سائیں سائیں کرنے لگتا اور نیند سے آنکھیں بوجھل ہو جاتیں۔ بیڈ پر جاتے ہی ہوش نہ رہتا کہ میں کہاں ہوں۔

میرے اردگرد رہنے والے لوگوں کا رویہ نظروں کی حد تک بدل گیا تھا۔ ہیلو ہائے تک تو بات پہلے بھی تھی۔ پہلے کئی دن تک وہ ٹھیک بھی رہے تھے۔ مگر اچانک ان کی نگاہوں میں اجنبیت کے علاوہ کوئی ایسا جذبہ تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ مجھے شدید الجھن ہونے لگی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت جیسا کوئی طنز تھا۔ اس رویہ کے ساتھ ہی خاص تبدیلیاں آ گئیں۔ اب بلڈنگ کا چوکیدار میری آمد تک ہشاش بشاش رہتا۔ میری موٹر سائیکل کو دیکھ کر ایسے چوکنا ہو جاتا جیسے میں کوئی اہم شخصیت ہوں یا کوئی پُر اسرار چیز۔ جب کہ پہلے وہ اونگھتا ہوا پایا جاتا تھا۔ بند دروازے ہلکی سی جھری کے ساتھ کھل جاتے۔ باہر سے میں قطعاً نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اندر سے کون دیکھ رہا ہے لیکن میرے گزر جانے کے بعد دروازے بند ہو جاتے تھے۔

میرا فلیٹ تیسری منزل پر تھا اور میرے راستے میں تین بلب پڑتے تھے جو اکثر فیوز یا غائب ہوتے مگر اب وہاں نئے بلب لگے ہوئے تھے، جو بھی روشن تھے۔ رضوی صاحب اور سلہری صاحب پہلے شطرنج کی بازی اپنے اپنے فلیٹ پر جمایا کرتے تھے لیکن اب وہ باہر راہداری میں بیٹھنے لگے تھے۔ میری طرف متوجہ ہونے کے باعث وہ اپنی چالیں اور مہرے بھول جاتے اور میں انہیں آداب کہہ کر گزر جاتا۔

میں خود حیران تھا کہ آخر وہ لوگ میرے بارے میں اتنا تجسس کیوں رکھتے ہیں میں کوئی اتنا خاص اور اہم بندہ نہیں تھا، بس ایک مقامی اخبار کا اسٹاف رپورٹر تھا۔ جو سارا دن شہر کی خاک چھاننے کے بعد اخبار کے دفتر چلا جاتا۔ سورج ڈوب جانے پر وہاں سے نکل کر اس ہوٹل کی جانب نکل جاتا جہاں سے میں کھانا کھاتا اور کھانے کے بعد احباب سے گپ شپ کر کے رات گئے اپنے فلیٹ کی جانب لوٹ آتا۔

بہت دن گزر گئے ان کے رویہ سے میں پریشان تھا۔ آخر ایسی کون سی بات ہی جو یہ لوگ مجھ سے نہیں کہتے؟ اتنی عجیب نظروں سے مجھے کیوں گھورتے ہیں؟ میرے بارے میں تجسس کیوں رکھتے ہیں؟ اب تو مجھے خوف آنے لگا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دیکھی چیزوں سے خوف محسوس

ہوتا ہے۔ جیسے جیسے میں بلڈنگ کے قریب جاتا ویسے ہی گھبراہٹ ہونے لگتی۔ طبیعت میں بھاری پن محسوس ہونے لگتا۔ سیڑھیاں بمشکل چڑھ پاتا۔

پھر ایک دم ماحول بدل گیا۔ اب چوکیدار مجھے دیکھ کر نظر انداز کر جاتا۔ رضوی اور سلہری صاحب کی بساط نہ جانے کہاں جمتی۔ کوئی دروازہ اب نہیں کھلتا تھا۔ دوپہر سے پہلے جب میں نکلتا تو کوئی نوجوان مجھے دیکھ کر نہیں ہنستا تھا۔ بلب پھر سے فیوز ہونے لگے تھے۔ بوڑھی عورتوں نے گھورنا بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں تیوروں پر بل نہیں ڈالتی تھیں۔ بلکہ کوئی نہ کوئی ایک آدھی ہلکی سی مسکراہٹ سے بھی نواز دیتی۔ اب یہ ماحول بھی میری سمجھ سے بالاتر تھا، کیونکہ یہ دونوں قسم کے رویے میں نے ان کی آنکھوں تک محدود دیکھے تھے، کسی نے مجھ سے بات تک نہ کی تھی۔ بس چوکیدار تھا جو مجھ سے بات کر لیتا، وہ بھی حال احوال کی حد تک۔ جب کبھی میں اسے تھوڑے بہت پیسے دیتا۔ ایک دن معمول کے مطابق اُٹھا تو سر بہت بھاری تھا۔ اٹھنے کو ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی کوشش کر کے اُٹھ بیٹھا مگر اُٹھتے ہی ایسا زوردار چکر آیا کہ میں دوبارہ بیڈ پر آن گرا۔ تھوڑی دیر بعد ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ مجھے تیز بخار تھا۔ اس دن میرا جانا لازمی تھا۔ مگر اس حالت میں جا نہیں سکتا تھا۔ میں نے ہمت کی اور دروازہ تک گیا باہر جھانکا تو کوئی نہیں تھا۔ اوپری منزل پر سناٹا تھا میں نے ہمت کی اور نیچے اُتر آیا قریب ہی ایک دکان سے میں نے اپنے دفتر فون کر کے بتایا کہ اس وقت میری حالت کیا ہے۔ واپس بیڈ پر پہنچنے تک مجھے اتنی تھکاوٹ ہو چکی تھی کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔

پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ کسی نے دروازہ بجایا۔ میں نے نقاہت زدہ آواز میں اندر آنے کو کہا تو وہ میری ساتھی اسٹاف رپورٹر مس نائیلہ راٹھور تھی۔ اور اس کے ساتھ ڈاکٹر خالد تھے انہوں نے آتے ہی خوش دلی سے کہا:

''ہوں تو جناب! آج کل صاحب فراش ہیں۔''

''آہ...... یہی تو معلوم نہیں ہوتا کہ آخر کسی کے غم میں؟'' نائیلہ نے شوخی سے کہا۔

''کیوں بھئی بولتے کیوں نہیں؟'' ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور تو کوئی غم نہیں سوائے غم روزگار کے۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ نائیلہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر نے نسخہ لکھ دیا۔ پھر وہ ڈاکٹر کے ساتھ اُٹھ گئی اور دروازے سے ہانک لگا کر کہا: ''میں ابھی میڈیسن لے کر آ رہی ہوں۔'' خاصی دیر بعد وہ لوٹی۔ وہ نہ صرف دوائیاں لے کر آئی تھی بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی وافر مقدار میں لے آئی تھی۔ کچھ پھل میرے قریب رکھ کر حکم صادر کیا کہ جلدی سے کھا لو تاکہ پھر دوائی بھی کھانی ہے۔ وہ کچن میں گھس کر نہ جانے کیا بناتی رہی اور پھر میرے قریب آ کر بولی ''میں نے کچھ چیزیں فریج میں بنا کر رکھ دی ہیں۔ دوائی لے لینا۔ کسی قسم کی فکر مت کرنا۔ تمہارا کام میں سنبھال لوں گی۔ جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ تم بن ہماری محفلیں زیادہ دن تک نہ سونی رہیں۔ میں کل پھر آؤں گی اور ہاں رات اگر کوئی کام کیا تھا تو مجھے دے دو۔''

میں نے رائٹنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے اپنے مطلب کی چیزیں اُٹھا لیں اور چلی گئی۔ اگلے دن وہ پھر آئی اپنا کام چیک کروایا اور مزید معلومات لے کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ نہیں آئی۔ میری طبیعت قدرے ٹھیک تھی۔ میں یہ سوچ کر دفتر چلا گیا کہ کام وغیرہ نہیں کروں گا مگر طبیعت تو بہل جائے گی۔

سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں نائیلہ کے آنے سے یہ لوگ برا محسوس نہ کر گئے ہو۔ ایک اکیلا اور اوپر سے نوجوان۔ جہاں اس کے پاس ایک اکیلی لڑکی کا کیا کام؟ اسی شام مجھے پھر ذہنی اذیت ہوئی۔ ان لوگوں کی نظریں دوبارہ بدل گئیں۔ اب نگرانی کرنے والے معمولات تو نہیں تھے لیکن کسی کی نظریں میرا مذاق اڑا رہی تھیں کسی آنکھ میں طنز تھا، کوئی خفگی سے دیکھ رہا تھا، کوئی حقارت سے اور کسی کی نگاہیں غصے سے بھری ہوئیں تھیں۔ میں ایسی ہی نظروں کے حصار میں بمشکل اپنے فلیٹ تک پہنچا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟ ایک دفعہ جی میں آیا کہ بلڈنگ ہی چھوڑ دوں مگر کیوں؟ اسی سوال کے جواب میں یہی سوچتا رہا کہ آخر ان کے رویے میں تبدیلی کیوں ہے؟

سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں نائیلہ کے آنے سے یہ لوگ برا محسوس نہ کر گئے ہو۔ ایک اکیلا اور اوپر سے نوجوان۔ جہاں اس کے پاس ایک اکیلی لڑکی کا کیا کام۔ مگر پہلے تو نائیلہ نہیں آئی تھی۔ تب انہوں نے ایسا رویہ کیوں رکھا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے نیند آ گئی اور پھر پتہ ہی نہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔ صبح اٹھا تو پھر حرارت تھی۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ اس دوران نائیلہ کے ساتھ دوسرے کارکن ساتھی بھی آتے تھے۔ چند دن بعد میں بھلا چنگا ہو گیا۔ میں نے بلڈنگ والوں کے بارے میں سوچا اگر ان کا یہی رویہ رہا تو مجھے کیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے برا ہی سمجھتے ہونگے تو سمجھتے رہیں۔ اب جب کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تو میں کسی سے کیوں پوچھوں؟ جب کوئی بات کرے گا تو دیکھا جائے گا۔ میں کیوں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اتنا ہلکان ہو رہا ہوں۔ ایسا کئی دن چلتا رہا۔ اب میں نے توجہ دینی چھوڑ دی۔

اس دن ٹھہرے پانی میں پہلا پتھر مسز علیم نے مارا۔ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا اور وہ سامان سے لدی اوپر آ رہی تھیں۔ زیادہ سامان کی وجہ سے وہ کانپ رہیں تھیں میں از راہِ ہمدردی انہیں سامان پہنچانے کی پیشکش کی۔ جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ میں سامان لے کر تیسری منزل پر پہنچا تو انہوں نے سامان دروازے پر ہی رکھ دینے کو کہا۔ اور اس وقت تک دروازہ نہ بجایا جب تک میں واپس جانے کے لیے نہ مڑ گیا۔ رات جب میں واپس آیا تو ایک خط دروازے سے نیچے اندر پھینکا ہوا۔ کھول کر پڑھا تو مسز علیم کی بیٹی عافیہ کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے میں ان کے دروازے تک آیا بھی لیکن اس کی ماں کی وجہ سے اندر نہ جا سکا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایک خاص وجہ سے مسز علیم نے مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مگر وہ خاص وجہ نہیں لکھی۔ اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہی وہ خاص وجہ ہے جس کی وجہ سے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔

میں عافیہ کو جوابا جذباتی سا خط لکھ کر وہ خاص وجہ معلوم کر سکتا تھا مگر ایسا کرنا میں گھٹیا کام سمجھتا تھا۔ میں اس لڑکی کے جذباتی پن سے بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا لیکن میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ میں نے اس خط کو بالکل نظر انداز کر دیا اور پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ایک رات جب میں اپنے کام میں محو تھا۔ ساری بلڈنگ میں خاموشی طاری تھی ان پر سکون لمحات میں مجھے ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا کہ اچانک دروازے پر زور دستک ہوئی۔ میں بری طرح چونک گیا ان پر سکون لمحات میں کوئی دروازے پر دستک دے اور وہ بھی بری طرح، انتہائی بدتمیزی سے تو اعصاب جھنجھنا کر رہ جاتے ہیں۔ غصہ میرے دماغ میں اچانک بھر گیا، کوئی تمیز ہوتی ہے دروازہ بجانے کی۔ یہ تو اجڈپن کی انتہا تھی۔ میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی بھی ہو کھری کھری سنا دوں گا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میرا جاننے والا اتنا گنوار نہیں ہو سکتا۔ اسی اثناء میں دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ کیا باہر سے آنے والا مُردوں کو زندہ کرنے کی کوشش میں ہے جو

یوں دھماکے کر رہا ہے۔ میں نے غصے سے قدم رکھا۔ ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور اپنے آپ کو پرسکون حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے اسی حالت میں گزرے تو دروازے پر پھر دھماکہ ہوا۔ میں گولی کی طرح اُٹھ کر دروازے تک گیا اور دروازہ کھول دیا۔

باہر خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔ سب سے آگے بلڈنگ کا ایک نوجوان جو انگریزی فلم کے ہیرو کی نقالی کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بڑے ایکشن میں تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے ہی جیالے تھے ان کے پیچھے رضوی اور سلہری صاحب تھے۔ کچھ اور بزرگ ٹائپ لوگ تھے۔ چند خواتین بھی تھیں اور چند دروازے جبری کی حالت میں کھلے تھے۔ ایک تو میرا دماغ پہلے ہی تپا ہوا تھا اوپر سے اتنی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر چکرا گیا۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے؟ کہیں ان لوگوں نے یہ تو فرض نہیں کر لیا کہ میں فوت ہو گیا ہوں۔ مگر یہ لوگ اتنے بااخلاق نہیں ہو سکتے، بات کچھ اور ہی ہے۔ میں ابھی اس واقعہ کو سمجھ ہی رہا تھا کہ وہ انگریزی فلموں کا نقلی ہیرو مجھے ایک طرف دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ تب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے اس کا کالر پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔

”او مسٹر! کس کی اجازت سے اندر جا رہے ہو۔ جو بات ہے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر کرو۔“ اس نے میری بات کا جواب تھپڑ کی صورت میں دیا جو میرے دائیں کان کے اوپر لگا۔ اب میرا دماغ بالکل ہی گھوم گیا۔ میں نے اسے پوری قوت سے اُٹھایا اور باہر راہداری میں پھینک دیا۔ وہ وہیں ست گیا اور اُٹھ نہ سکا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کے تاثرات میرے حق میں بدلے ہوئے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے لہجے کو نرم کر کے کہا ”فرمائیں کیا بات ہے اور کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

”ہم تمہارے کمرے میں آنا چاہتے ہیں۔“

”اس طرح؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا۔ آپ لوگ پہلے مجھے یہ تو بتائیں کہ آپ یوں کیوں میرے کمرے میں آنا چاہتے ہیں۔“

”ہمیں تم پر شک ہے؟“ ایک جیالا بڑے غصیلے لہجے میں بولا۔

”کس بات کا شک ہے۔“ میں نے حیرانگی سے کہا۔

”وہ تمہیں معہ ثبوت ابھی دکھاتے ہیں۔ سیدھی طرح اندر آنے دو ورنہ......“

”ورنہ کیا کر لو گے۔“ میرا غصہ انتہا کو چھو رہا تھا۔ ”نہیں آنے دوں گا اندر، تم لوگ جو چاہے کر لو۔“ اور ساتھ ہی میں نے دروازہ بند کر لیا غصے کی لہر نے میرا دماغ ماؤف کر دیا۔ باہر سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں میں اپنے اعصاب کو پرسکون کرتا رہا۔ میں اس افتاد سے بُری طرح جھنجلا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی افتاد تھی جو میری بالکل ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کون سی خاص وجہ ہے۔ جس کی وہ لوگ جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں۔ کتنے ہی لمحے گزر گئے باہر سے ہلکی ہلکی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ پھر اچانک دروازے پر دستک دی گئی اور یہ دستک لگاتار دی گئی تو میں دھاڑا

”کون ہے؟“

”پولیس ..... دروازہ کھولیں۔“ میں اچانک گڑبڑا گیا۔ یہ پولیس کہاں سے آ گئی؟ دروازہ کھولا میرے سامنے انسپکٹر شاہد تھا جو مجھے اچھی طرح جانتا تھا مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”ارے آپ یہاں......!!“ وہ بولا۔

”ہاں مجھے یہاں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اور کیا تم مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہو؟“

”چلو اندر چل کر بیٹھیں۔“ شاہد نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے راستہ دیا۔ ساتھ آئے پولیس مین کو اس نے وہیں رہنے کا اشارہ کیا۔ صوفے پر ٹکنے کے بعد میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا: ”یہ لوگ آپ پر الزام لگا رہے ہیں کہ آپ یہاں اپنے کمرے میں عورت لے کر آئے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ بقول ان کے کہ وہ یہاں ایسی غلاظت برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ آپ کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر بلڈنگ سے نکالنا چاہتے ہیں۔“

”یہ سراسر الزام ہے، تہمت ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ میرے فلیٹ کی تلاشی لے سکتے ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن میں اگر آپ سے یہ کہوں کہ کیوں نہ بلڈنگ والے ہی اپنا اطمینان کر لیں؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ چند لمحوں بعد وہ فعلی ہیرو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اور وہ سارے گھر میں ”عورت“ تلاش کرتے رہے۔ لیکن وہاں کچھ ہوتا تو ملتا۔ جب ان کی تلاش ختم ہو گئی تو میں نے باہر موجود سب ہی کو بلایا۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ میں نے براہ راست انسپکٹر شاہد کو متوجہ کر کے کہا

”ان سے پوچھیں ان کا اطمینان ہو گیا ہے؟“

”نہیں ہمارا اطمینان نہیں ہوا۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”کیوں نہیں اطمینان ہوا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”وہ اس لیے کہ ہم نے خود اندر سے نسوانی آوازیں سنی ہیں اور رات گئے بار بار سنی ہیں۔“ میرا منہ کھلا رہ گیا۔ خدا را یہ کیسا الزام ہے۔ نائیلہ کبھی آتی بھی تھی تو دن کے وقت اور واپس چلی جاتی تھی۔ رات کے وقت کوئی عورت؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی؟

”میں آپ کو یقین......“ ایک اور شخص نے میری بات کاٹتے ہوئے فوراً چند مکالمے سنا دیے۔ جو میرے اور اس ”عورت“ کے درمیان آج رات ہی ہوئے تھے۔ ایک دم ہی مجھے وہ مکالمے سن کر خیال آیا کہ یہ ان کی شدید غلط فہمی ہے اور جو سراسر ان کے جا بے جا شک کی بنیاد پر ہے۔ اب میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ میں اٹھا اور اپنی لکھنے والی میز تک گیا۔ وہاں پر موجود ٹیپ ریکارڈر میں پڑا ہوا کیسٹ تھوڑا سا پیچھے کیا۔ اور پھر اس کو دوبارہ چلا دیا۔ اس میں سے ایک عورت وہی مکالمے ادا کر رہی تھی۔ جو ابھی اس شخص نے مجھے بتائے تھے۔ یہ ایک فلمی اداکارہ کا انٹرویو تھا، جو میں دو، تین روز قبل ہی ٹیپ کر کے لایا تھا۔ اور رات کو کیسٹ ریکارڈر کی مدد سے اس انٹرویو کو لکھ رہا تھا۔ تا کہ اخبار میں شائع کیا جا سکے۔ میں نے سب کی طرف دیکھا، وہ لوگ کھسیانے سے ہو کر ایک ایک کر کے چلے گئے۔ انسپکٹر شاہد نے معذرت کی اور چلا گیا۔ میں اس وجہ خاص پر دیر تک ہنستا رہا۔

❀❀❀

دھواں میں تحلیل چہرہ

میں نے بائیک بند کر کے اسٹینڈ پر لگائی تو یکدم سناٹا چھا گیا۔ بیوہ کی آنکھوں کی مانند وہ تنگ گلی ویران تھی۔ میں نے اپنے بند گھر کا تالا کھولا بائیک گھسیٹ کر اندر کھڑی کی اور بستر پر جا لیٹا۔ تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ نیند آنکھوں میں گھستی چلی آ رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اٹھ کر کپڑے تبدیل کئے اور باہر کا دروازہ لگانے لگا تو میری نظر سامنے گھر پر پڑی جو روشن تھا، صبح تک وہ گھر بے آباد تھا۔ میں اس بارے میں مزید سوچنے کی زحمت کئے بغیر بستر پر لیٹا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا میں کہاں ہوں۔

اگلی صبح میں دفتر جانے کیلئے نکلا تو اس گھر کے سامنے ایک خوبصورت سا بچہ کھڑا تھا۔ میں بائیک کھڑی کر کے مکان کو تالا لگانے لگا تو اتنی دیر میں وہ بچہ میری بائیک کے قریب آن کھڑا ہوا۔ میں نے اسے پیار کیا تو وہ اپنی توتلی زبان میں کہنے لگا۔

''انکل...... مجھے سیر کرائیں۔'' بڑا بے تکلف بچہ تھا لیکن میں اب اس کو کہاں سیر کرانے لے جاتا؟ میں نے پیار سے کہا۔

''دیکھو بیٹا! میں جا رہا ہوں، شام کو سیر کراؤں گا......اب آپ جائیں۔'' وہ فوراً ہی مان گیا اور چلا گیا۔

اگلی صبح پھر وہی ہوا، دفتر جانے کیلئے نکلا تو وہ وہیں کھڑا تھا۔ اس نے پھر مجھے سیر کرانے کو کہا تو میں نے پھر ٹال دیا۔ اس طرح اس کے فوراً مان جانے کی وجہ سے میں دو تین دن تک اسے ٹالتا رہا۔ اس دن چھٹی تھی۔ میں ناشتہ کر کے شاپنگ کرنے نکلا تو وہ بچہ مجھے نظر نہیں آیا۔ واپسی پر بھی نہیں تھا۔ نجانے کیوں مجھے اس بچے کی معصومیت کا احساس ہوا، دل میں خیال آیا کہ اس بچے کی خواہش پوری کرنی چاہئے مگر کس طرح؟ یوں بچے کو بلا کر بائیک میں بٹھا کر لے جانا مجھے عجیب سا لگا اور سوچا کہ اس کے گھر والے کیا سوچیں گے اور گلی محلے والے کیا سوچیں گے؟

یہی سوچ کر اس خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں جس مکان میں رہتا تھا وہ میرے پھوپھا کا تھا، میری پھوپھی اور ان کے تین بچے جن میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ بڑے خوش و خرم یہاں دن گزار رہے تھے کہ اچانک پھوپھا ایک حادثے میں وفات پا گئے۔ انہوں نے یہاں کاروبار شروع کر رکھا تھا جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میرا کزن عارف ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میری پھوپھی ہمارے ہاں چلی گئیں اور مجھے حکم صادر ہوا کہ اس کاروبار کو میں سنبھالوں۔ پھر مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی تعلیم اُدھوری چھوڑ کر ان کا کاروبار سنبھالنا پڑا۔ میرے والد اچھے خاصے زمیندار تھے اور مجھے ضرورت بھی نہ تھی مگر پھوپھی کے بچوں کے مستقبل کی خاطر مجھے قربانی دینا پڑی۔ ہوسٹلوں میں رہنے کی وجہ سے مجھے اکیلا رہنے کی عادت پڑ چکی تھی سو مجھے زیادہ اکیلا پن محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس دن میں اخبار پڑھنے میں مصروف تھا کہ کسی نے بیل دی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا تو ایک اُدھیڑ عمر کے صاحب کھڑے تھے اور ان کی گود میں وہی بچہ تھا۔

"جی فرمائیے؟ سلام کا جواب دینے کے بعد میں نے پوچھا۔

"یہ بچہ آپ کو روز تنگ کرتا ہوگا؟" وہ بولے۔

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں...... آئیں اندر تشریف لے آئیں۔" میں انہیں لے کر اندر آ گیا۔ تھوڑی دیر باتوں کے بعد وہ کہنے لگا۔

"پوتا ہے یہ میرا۔ اس کا باپ چند ہفتے ہوئے ہیں باہر ملک چلا گیا ہے۔ اس کے پاس موٹر سائیکل تھی جواب بیچ دی ہے۔ وہ اس کو بہت گھماتا رہتا تھا اور مجھے تو موٹر سائیکل چلانا نہیں آتا۔ یہ روز شام کو باہر نکل کر آپ کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ پھر جب آپ نہیں آتے تو رونے لگ جاتا ہے۔"

"اوہ۔ سوری صدیقی صاحب! ہوتا یوں ہے کہ مجھے صبح جانے کی جلدی ہوتی ہے اس لئے میں اس معصوم کی خواہش پوری نہیں کر سکا۔ بہر حال! آج شام اسے گھما لاؤں گا۔"

اسی شام عدنان کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر آوارہ گھومتے ہوئے مجھے خوب بڑا مزہ آ رہا تھا کہ کبھی کبھی بے مقصدیت میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ میں نے اسے آئس کریم کھلائی۔ دو چار کھلونے لے کر دیئے اور رات ڈھلے میں نے اسے گھر چھوڑ دیا۔

صدیقی صاحب سرکاری ملازم تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، دونوں ہی ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں جو پڑھتی تھیں حال ہی میں ان کا تبادلہ اس شہر میں ہوا تھا۔ بیوی وفات پا چکی تھی۔ بڑی بہو بڑے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی جبکہ چھوٹے بیٹے عدیل کی بیوی ان کے ساتھ تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ان کے ساتھ اچھے مراسم ہو گئے۔ عدنان کو گھمانا، ویسے بھی اب میرا فرض بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ میری انسیت بھی بہت ہو گئی تھی۔ یوں دن گزرتے چلے گئے۔

ایک رات جب واپس آیا تو خوبصورت سا لفافہ دروازے کے ساتھ ہی پڑا ملا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو ایک نہایت نفیس کاغذ کے اوپر انگریزی میں ایک دو جملے لکھے ہوئے تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں خود پر تھوڑی سی توجہ دوں تو زیادہ ہینڈسم دکھائی دے سکتا ہوں کوشش کر کے دیکھوں۔ فقروں کے اختتام پر لکھا تھا۔ "آپ کو اچھا دیکھنے کی خواہش رکھنے والی۔" میں بہت حیران ہوا۔ اس قسم کا خط میں نے زندگی میں پہلی دفعہ پایا تھا۔ کون ہو سکتی ہے یا ہو سکتا ہے؟ ایک لمحے کو میں نے سوچا مگر پھر اسے مذاق سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ خطوں کا تانتا بندھ گیا، دوسرے تیسرے دن ایک خط آ جاتا، جس میں چند جملے انگریزی میں ہی لکھے ہوئے تھے اور ان جملوں میں میری ذات میں گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا اور اس خط کے بعد تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگا، جس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں...... میرا ڈسٹرب ہو جانا ایک فطری عمل تھا، تجسس یہی تھا کہ کون ہے اور کیا کوئی دوست مذاق کر رہا ہے یا واقعی کوئی لڑکی ہے، اگر لڑکی ہے تو سامنے کیوں نہیں آنا چاہتی اور ایسا کر کے وہ کیا چاہتی ہے؟...... خط اسی شہر سے آتا تھا اور ہمارے علاقے کے پوسٹ آفس کی مہر لگی ہوتی تھی۔ وہ مجھے اس قدر قریب سے دیکھتی تھی کہ اسے یہ تک معلوم ہوتا کہ میں نے کس دن شیو کی ہے، کس دن نہیں...... وہ اپنے خطوط میں بڑی مستقل مزاج تھی۔ وہ لکھتی رہتی کہ میں فلاں قسم کا ہیئر اسٹائل بنواؤں، فلاں طرح کے کپڑے پہنوں۔ میں نے اس کی کسی بات پر عمل نہیں کیا جس پر وہ احتجاج بھی نہیں کرتی تھی۔ جس خط میں اس نے لکھا تھا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں، اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اس کو جواب دوں، اس صورت میں کہ اس کے بتائے ہوئے کپڑے پہنوں۔ میں نے ایسا تو

کچھ نہ کہا لیکن دل میں ٹھان لی کہ اب اس کا سراغ لگا کر رہوں گا۔

ان دنوں معمول سا بن گیا تھا کہ میں عدنان کو ہر جمعہ کے دن سیر کرواتا، صدیقی صاحب دوپہر کے بعد میرے پاس بیٹھے رہتے اور بااصرار رات کا کھانا اپنے ہاں کھلاتے جس پر خاصا اہتمام ہوتا تھا۔ ان کی بہو کی میں نے صرف آواز سنی تھی اور ان کی کسی بیٹی کو آج تک نہیں دیکھا تھا۔

خطوط کی آمد بدستور اسی طرح تھی اور میری سوچ اسی چکر میں غلطاں و پیچاں رہتی کہ وہ کون ہو سکتا ہے یا ہو سکتی ہے؟ بہت دفعہ خیال صدیقی صاحب کی بیٹیوں کی طرف گیا کہ وہ جب سے آئے ہیں۔ خطوط کی آمد بھی ان کے بعد ہی شروع ہوئی ہے۔ وہی مجھے انتہائی قریب سے دیکھ سکتی ہیں مگر کون سی، چھوٹی والی یا بڑی؟ کسی کا میں نے چہرہ تک نہیں دیکھا تھا کہ اس سے اندازہ ہو جاتا۔ میں ایک ماہ اس چکر میں رہا لیکن مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

خطوط کی آمد اسی طرح تھی جس میں اَب یکسانیت تھی۔ یہ فقرہ ضرور ہوتا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔

ایک رات اچانک مسلسل بیل بجنے سے میری آنکھ کھل گئی میں دروازے پر گیا تو سامنے صدیقی صاحب کی بہو پریشان کھڑی تھی۔

"خیریت تو ہے؟"

"وہ ابو کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ پلیز، کسی ڈاکٹر کو بلوا دیں۔۔۔۔ مجھے پتہ نہیں ہے ورنہ......!!

"آپ جائیں میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی اور کچھ دیر کے بعد پچھلی گلی میں رہنے والے ڈاکٹر کو میں ساتھ لے گیا۔ اس نے ان کی حالت کافی سیریس بتائی۔ لہٰذا میں صدیقی صاحب کو ہسپتال لے گیا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا لیکن طبی امداد ملنے کے باعث وہ خطرے سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ چند دن ہسپتال میں رہے اور پھر گھر آ گئے۔ میں رات گھر آنے کے بعد ان کے پاس کچھ دیر کو ہوتا لیکن ان لڑکیوں کی موجودگی کے احساس کے علاوہ میں ان کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔ البتہ اَب ان کی بہو عصمت میرے سامنے آ جایا کرتی۔

ایک عرصے تک خطوط پاتے رہنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ جو کچھ بھی کہے گا یا کہے گی میں اس پر عمل کروں گا، کیونکہ اگر یہ شرارت ہوتی تو بہت جلد وہ اُکتا جاتا کیونکہ ایسے چکر میں نتیجے کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔ اب مجھے یہ بے چینی تھی کہ جو کوئی ہے سامنے آ جائے...... یہ سوچ کر میں وہی کرنے لگا جیسا مجھے کہا جاتا۔

ایک رات کا دوسرا پہر تھا کہ اچانک بیل بجی۔ میں دروازے پر آیا تو ایک لڑکی کھڑی تھی، اندھیرے میں بس یہی دیکھ سکا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا یا پوچھتا، وہ اندر آ گئی اور دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ ٹیک لگا کر گہری، گہری سانس لینے لگی۔ میں حیران و پریشان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک آہستہ سے میرے منہ سے نکلا۔

"کون ہو تم......؟"

"میں......"

یہ کہہ کر بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر یکدم ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ رات تنہائی، جوان لڑکی اور اس سے ابھرتی ہوئی مہکی پرفیوم کی مسحور کن خوشبو، سب کچھ دیوانہ بنا دینے کیلئے کافی تھی۔ لیکن یکدم ہی میں اس حصار سے باہر آ گیا۔ میں نے اسے خود سے علیحدہ کیا تو

اس کی آنکھیں گویا نشے سے بھری ہوئی تھی، خوبصورت چہرے پر تراشیدہ ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ پھر میں اسی حصار میں میں چھنتے چھنتے رہ گیا اور باہر گلی میں نکل کر دیکھا تو وہ اب بھی کسی بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑی ہوئی تھی۔ چند آوارہ کتے گلی کی نکڑ پر بیٹھے تھے اس سرد موسم میں کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ باہر نکلے مگر اندر اِک آگ میری منتظر تھی...... میں واپس آیا تو وہ میرے بیڈ پر دراز ہوگئی تھی۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھا تو اس کی خوبصورتی کی دل ہی دل میں تعریف کئے بنا نہ رہ سکا، میں بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گیا اور بس اس سے اتنا ہی پوچھ سکا کہ خط وہی لکھتی ہے؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں ہی لکھتی ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری محبت قبول کی۔"

پھر اس کے بعد ہمیں ہوش نہیں رہا کہ کہاں ہیں، یہ جادو اس وقت ٹوٹا جب صبح کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ پھر وہ چلی گئی لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ میں اس سے پوچھ سکوں کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی اور اس کا نام کیا ہے؟

اب خطوط آنا بند ہو گئے تھے لیکن میرا ذہن ہر وقت ادھر ہی اُلجھا رہتا، جس سے یقیناً میری کارکردگی متاثر ہوتی تھی۔ میں جلد ہی سنبھل گیا اور اب بس ایک تمنا تھی کہ میں معلوم کرلوں کہ وہ کون تھی جو پوری رات مجھے ہوش سے بیگانہ کئے رہی اور خود بھی بکھر کر سمٹتی رہی۔ فطری طور پر طبیعت میں جھجک ہونے کے باعث میں اتنی کوشش نہ کرتا کہ کہیں کسی بھی غلط اقدام سے چھچھورا یا بدکردار نسان کے طور پر نہ جانا جاؤں، میں اسی انتظار میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح معلوم کرلوں۔ یہ بہرحال مجھے یقین تھا کہ ان ہی میں سے ایک ہے۔ میں بھی اس کھیل میں بھی لذت محسوس کرنے لگا تھا۔

پھر ویسی ہی ایک رات اور آگئی۔ بیل بجی اور وہ بے دھڑک اندر آگئی، انداز میں وہی جنون اور آگ تھی جس سے چند لمحوں میں آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ میں نے خود کو سنبھالا اس سے پہلے کہ میں بے خود ہو جاؤں میں نے اس سے کئی سوال کر ڈالے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اپنی نشیلی پلکیں اُٹھا کر کہتی چلی گئی۔

"میں اس شدت سے آپ کو پیار کرتی ہوں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی، سرد راتوں میں تنہا آپ کے پاس چلی آتی ہوں اس سے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنا سب کچھ آپ کے آگے ہار دیا ہے۔ میں نے بہت سوچا اور بار بار سوچا ہے لیکن میں اور آپ کبھی بھی ایک بندھن میں نہیں بندھ سکتے، یہ جاننے کے باوجود میں اس دل کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہوں اور آپ کو چاہے چلی جا رہی ہوں، ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے گڑھے میں چھلانگ لگا دی ہے یا منزل کے قریب پہنچ چکی ہوں، لیکن مجھے یہ پختہ یقین ہے کہ میں کسی اور کی دلہن بنوں گی۔ میں اپنے آپ سے ہار کے صرف اپنی غرض اور اپنے آپ سے مجبور ہو کر چلی آتی ہوں۔ میں نڈر ہوں یا بزدل، مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ آپ سے یہی درخواست کروں گی کہ آپ میرے بارے میں نہ جانیں تو بہتر ہے۔ میں کل کسی کی ہو جاؤں گی تو اس طرح آپ مجھے خواب سمجھ کر جلد بھول جائیں گے۔ آگہی کے دکھ سے بچ جائیں گے اور قیمتی تو یہی لمحے ہوتے ہیں نا! بس انہی کو امر کرلیں اور مجھے بھی حسرت نہ رہے کہ کسی کو چاہا بھی اور اس کے قریب نہ ہو سکی۔ میں نے آپ سے پیار کیا ہے اور میں ہی آگے بڑھ کر اپنے حصے کے لمحے سمیٹ لیتی ہوں۔ کیا یہی کافی نہیں کہ میں آپ پر مرتی ہوں اور مجھے یہ احساس بھی ہے کہ یہ خوشی چند روزہ کی ہے۔ پلیز مجھے میری خوشیوں سے محروم نہ کریں اور اگر آپ کو یہ اچھا نہیں لگتا تو میں نہیں آؤں گی۔"

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ آخری دم تک چلوں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکے گا اور آپ کا میرے بارے میں نہ جاننا ہی بہتر ہے۔ باقی رہی نام کی بات تو آپ جو چاہے کہہ لیا کریں۔"

پھر وہ یونہی میری بے چینی اور بے کیف راتوں کو سجانے لگی۔ جس رات آتی، زندگی اپنے پورے جوبن پر جا کر نکھر جاتی۔ ان راتوں پر میری دسترس نہیں تھی، وہ جب چاہتی آجاتی۔ کبھی دوسرے ہی دن اور کبھی طویل وقفے کے بعد...... اگرچہ میرے اندر اس کے بارے میں تجسس تھا لیکن میں نے اس کے کہنے پر نہ تو کوشش کی اور نہ پوچھا۔ بس یہ یقین تھا کہ وہ وقت کے ساتھ خود ہی بتا دیگی۔ مجھے خود بھی اس کے بارے میں جاننے کی اتنی جلدی نہیں تھی۔ یوں آنکھ مچولی میں کئی ماہ گزر گئے۔

اچانک ایک دن اس کا خط آیا کہ اب میں آپ سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔ وقتی طور پر چند دن میں ڈسٹرب رہا کیونکہ اس کے آنے کی، اس کے انتظار کی عادت سی بن گئی تھی۔ پھر میں نے اسے بھلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ میرے سامنے والے گھر میں ہی تو رہتی تھی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ کسی طرح بھی اس کو دیکھوں گا اور اس سے بات کروں گا کہ یوں کیوں آنا ترک کر دیا۔ یہ مسئلہ اس وقت حل ہوتا نظر آیا جب ابو کی طرف سے پیغام ملا کہ میری امی اور پھوپھی تمام بچوں سمیت چند دنوں کیلئے آ رہے ہیں۔ وہ میری بہن کی شادی کیلئے شاپنگ کرنے آ رہے تھے۔ اگلے دن وہ آ گئیں۔ شام ڈھلے جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ارد گرد کے ہمسایوں کے علاوہ صدیقی صاحب کے یہاں سے بھی ان کی بہو اور بیٹیاں آئی تھیں۔ امی ان کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔ صبح جاتے وقت میں نے عارف کو سمجھایا کہ جیسے ہی صدیقی صاحب کی بیٹیاں ادھر ہمارے گھر آئیں تم فوراً مجھے فون کر دینا۔ اس نے ایسے ہی کیا اور میں جتنی جلدی ہوسکا گھر پہنچا۔ عارف نے اشارے سے بتایا کہ اندر ہیں۔ میں چپکے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ معمولی شکل صورت کی لڑکیاں جنہیں ذرا بھی خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ پر حیرت کا پہاڑ یہ ٹوٹا کہ اگر وہ ان میں سے نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ یہ معمہ میرے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان بن گیا۔ میری آمد کا احساس ہونے پر وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ میں نے یونہی تصدیق کی خاطر پوچھا کہ یہ کون تھیں تو جواب ملا صدیقی صاحب کی بیٹیاں تھیں۔ مجھے سب کچھ گھومتا نظر آ رہا تھا۔ میں تو آج تک انہیں میں سے ایک کو فازی سمجھ رہا تھا۔ یہ حیرت اپنی جگہ الگ تھی۔ ساری سوچیں سلب کر دینے والی بات یہ تھی کہ فازی کون تھی؟ پورے ایک ماہ اسی الجھن میں گزر گیا لیکن یہ گتھی سلجھائے سلجھ نہیں رہی تھی۔ میں ہر وقت یہی سوچتا رہ جاتا میں یہ سوچ کر لرز جاتا کہ کہیں وہ چڑیل تو نہیں تھی جو انسانی روپ میں مجھے ملتی رہتی تھی مگر یہ سب ماننے کو ذرا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ تقریباً ایک سال گزر گیا اور میں اس بات کو بھول گیا وقت کی گرد نے اس کی یاد کو بہت حد تک ماند کر دیا تھا۔

اس رات فازی کا خیال میرے ذہن میں دور دور تک نہیں تھا مگر اس وقت حیرت سے میں گنگ رہ گیا جب وہ میرے بیڈ روم میں میرے سامنے کھڑی تھی شاید دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آن بیٹھی۔

"کیسے ہیں آپ......؟"

"تم...... کہاں چلی گئی تھی اور تم کون ہو؟"

"یہی تو بتانے آئی ہوں۔ ہم صدیقی صاحب کے ساتھ اوپر والے گھر میں رہتے ہیں۔ آپ نے کبھی توجہ ہی نہیں دی کہ میں کب سے آپ کو دیکھتی رہی ہوں۔ ہم تین بہنیں ہیں۔ میں نے جب آپ کو خط لکھا تھا تو اس دن سے بہت پہلے میں نے اپنے اندر آپ کی محبت کو پایا تھا۔ پھر یہ اس قدر پروان چڑھی کہ جنون کی حد تک میرے حواسوں پر چھا گئی۔ مگر میری منگنی ہو چکی تھی جو میرے چاہنے سے بھی نہیں ٹوٹ سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرے والدین مجھے قتل کر دیتے لیکن غیر برادری میں میری شادی ہرگز نہ کرتے۔ میں خط لکھ کر اپنی حسرت پوری کرتی رہی مگر آپ نے اپنے کسی انداز سے بھی مجھے یہ احساس نہیں دلایا کہ آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میں بدنامی کے خوف سے آپ کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔ میں شاید گھٹ کر رہ جاتی مگر آپ نے میرا مان رکھ لیا اور میں نے اپنا سب کچھ آپ پر نچھاور کرنے کی ٹھان لی۔ میں اس رات اتنی مجبور ہوئی کہ اپنا دل باندھ کر آپ کے دروازے تک چلی آئی۔ میں خود اپنی شناخت چھپا رہی تھی تاکہ آپ کے دل میں میرے لئے جذبہ پیدا ہو بھی جائے تو آپ مجھے تلاش نہ کر سکیں۔ میں اپنی حسرتیں پوری کرتی رہی اور پھر میری شادی ہو گئی اور میں اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی۔ آپ سے ملنے کو میرا دل بہت چاہ رہا تھا مگر مجھے یہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ بہرحال آخری بار آج آپ سے اس لئے ملنے آئی ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں، کہیں آپ ساری عمر میرے بارے میں اُلجھتے نہ رہیں......" یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئی۔ میں نے اسے پہلے کی طرح رات بھر کیلئے روکنا چاہا لیکن وہ رُکی نہیں بلکہ ہوا میں تحلیل ہو جانے کی مانند وہاں سے چلی گئی۔

چند ہی دن بعد وہ مجھے پھر نظر آئی۔ گلی میں اپنے بچوں اور میاں کے ساتھ آ رہی تھی۔ مجھ پر اس کی نظر پڑی لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق ایک رائی کے برابر بھی نہ تھی یوں جیسے اجنبی ہو۔ میں فازی اور اس عورت کے بارے میں بڑی دیر تک تجزیہ کرتا رہا تبھی میرے اندر سے کوئی آواز آئی۔ "فازی کا طرزِ عمل ٹوٹ کر چاہنے یا محبت کا نہیں تھا بلکہ ہوس تھی جو چند دلوں میں جگہ بناتی ہے اور نہ کوئی یاد کا ٹکڑا ذہن میں چھوڑتی ہے۔"

میں اپنی جگہ مطمئن ہو گیا۔ آج جب میں اس کو سوچتا ہوں، اس کو یاد کرتا ہوں تو اس کا چہرہ مجھے دھوئیں میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

جانور

وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ زندگی سے بھرپور آنکھیں لئے بڑی باوقار شخصیت کا مالک۔ وہ وجیہہ بھی تھا لیکن اس کی ساری وجاہت ان چند معمولی جوڑوں کی وجہ سے ختم ہو جاتی تھی جو وہ پچھلے برس سے پہنتا چلا آ رہا تھا۔ میرا اس کے ساتھ تعلق فقط "ہیلو، ہائے" تک محدود تھا۔ جیسے کہ دوسرے کلاس فیلوز کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ میرے حساب سے ان عام سے طالب علموں میں سے ایک تھا جنہیں پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ میں ایسے عام سے لوگوں کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ میرے اپنے چند مخصوص دوست تھے جو زندگی کے ہر لمحے سے خوشی کشید کر لینا چاہتے تھے۔

ہم تو موسم، رنگ، خوشبو اور چہروں کی باتیں کرنا پسند کرتا تھا کہ زندگی کے اس پہلو کے بارے میں جہاں ناآسودہ خواہشیں، حسرتیں، اُمیدیں اور خواہش، زندگی کا دامن پکڑ کر آہ و بکا میں مصروف ہوتی ہیں۔ جبر اور ظلم کا اِک تسلسل ہوتا ہے۔ ہمیں پڑھنے کی کوئی فکر نہیں تھی اور نہ ہی ڈگری حاصل کرنے سے رغبت، ہم تو فقط یونیورسٹی کا ماحول انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ شہاب کی بذلہ سنجی، فضل کی طنز آمیز تبصرہ آرائی، نبیلہ کی زندہ دلی، الوینہ کی جدید دنیا کے بارے میں معلومات، وقاص کا بے تحاشا دعوتیں کرنے کا شوق اور مجھے نئی گاڑیاں بدلنے کا جنون۔ ہم سب مل گئے تو ماحول لطف دینے لگا۔ اس دوران کے عام لوگوں کا خیال رہتا ہے؟

شاید دوسرا سال بھی ہمارا اس سے اچھی طرح متعارف ہوئے بغیر ہی گزر جاتا کہ اچانک ایک دن الوینہ نے انکشاف کیا۔

"وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے، اسے دوست بنانا چاہیے۔"

پہلے تو اس کا خوب مذاق اُڑایا گیا کہ کیا بکتی ہے۔ اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی۔ "اسے عشق و محبت کہتے ہیں اور یہ جراثیم اسے کہاں سے لگ گیا۔" وقاص نے اسے لتاڑتے ہوئے کہا۔

"یار! کچھ تو خیال کرو۔ اپنے اسٹیٹس کا احساس کرو۔ وہ تمہارے ایک گھنٹے کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا اور مجھے اُمید ہے کہ اسے گاڑی میں بیٹھنے کی تمیز بھی نہیں ہوگی۔ اگر عشق کرنا ہے تو اس بندے سے کرو جو تمہارے تمام قسم کے نخرے برداشت کر سکے۔"

"اور ہاں......!" فضل کہاں چپ رہ سکتا تھا۔ "کہیں یہ نا ہو کہ تم کھانے پینے کی فرمائش کرو تو وہ تمہیں گول گپے، آلو چھولے یا زیادہ سے زیادہ ٹھنڈی بوتل پر ٹرخا دے۔"

"ہاں الوینہ! اسے تو یہ تک پتہ نہیں ہوگا کہ نیل پالش کے شیڈز کتنے ہوتے ہیں۔" نبیلہ نے ہنس کر کہا تو وہ تلملا گئی۔

"خدا کیلئے میری بات تو سنیں، وہ مجھے اچھا اس لئے لگتا ہے کہ وہ اچھا ہے، ذہین ہے، باصلاحیت ہے اور تم لوگوں کو اطلاعاً بتا دوں کہ قائزہ

اس کیلئے میٹھے جذبات رکھتی ہے۔"

"فائزہ؟ وہ جو سر پر بڑا سا دوپٹہ لٹکائے رکھتی ہے؟" شہاب چونکا۔

"بالکل وہی۔" نبیلہ نے تصدیق کر دی۔

"ہاں! وہ ٹھیک ہے۔ لوئر مڈل کلاس کی لڑکی اس طرح کے لڑکے کے ہی خواب دیکھ سکتی ہے جو ایک پھول تحفہ دینے پر خوش ہو جاتی ہیں اور سو طرح کی اُمیدیں وابستہ کر لیتی ہیں۔" وقاص نے نخوت سے کہا۔

"اور ہاں سوری الوینہ، اگر تم نے اس سے دوستی رکھی تو پھر ہم تم سے دوستی نہیں رکھ سکیں گے۔ وہ اس لیئے کہ وہ ہمارے لئے اور ہم اس کیلئے مس فٹ ہیں۔" میں نے شدید حسد سے کہا۔

"تم سب اپنی ہانکتے رہو گے یا کچھ میری بھی سنو گے؟" الوینہ نے شدید غصے میں کہا۔

"کہو......!"

"وہ اچھا اس لئے لگتا ہے کہ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے یعنی پڑھتا وہ ہے، کتابیں اس نے کھنگالی ہیں اور فائدہ ہم اُٹھائیں گے؟"

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اسے تو ہماری دوستی پر ناز ہو گا۔"

"جی مجھے بھی کنگلے عاشق بنانے کا کوئی شوق نہیں۔ نہ تو میں کسی رومانوی ناول کی اور نہ ہی وکٹورین عہد کی کسی فلم کی ہیروئن ہوں۔ بلکہ اس جیتے جاگتے ماحول کا حصہ ہوں جس میں عشق و محبت کا معیار بھی دولت ہے۔"

رزلٹ کے اعلان کے ساتھ ہی جہاں میں نے اپنا رزلٹ دیکھا، وہاں لاشعوری طور پر اس کے مارکس بھی دیکھے۔ وہ کوئی پوزیشن نہیں لے سکا تھا مگر پھر بھی پہلے نمبر پر تھا۔ میرے خیال میں اسے گولڈ میڈل ملنا چاہئے تھا لیکن یہ اعزاز اسے نہ ملتا دیکھ کر میرے اندر کا حاسد شخص خوش ہوا۔ کیا فائدہ اتنا پڑھنے کا؟ اس کے بنائے نوٹس ہم جیسوں کے پاس ہونے کی ضمانت ٹھہرے۔ اس کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ وہ بے چاری فائزہ اس کے التفات کے لئے ترستی رہی جب کہ وہ اپنا مستقبل بنانے کے چکر میں اسے نظر انداز کرتا رہا بھلا ایسے لوگ عشق وغیرہ کہاں افورڈ کر سکتے ہیں۔ میں لاشعوری طور پر اس کے بارے میں سوچتا چلا گیا کہ اب یہ اپنی ڈگری اُٹھائے نوکری کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ اس کے پاس اگر دینے کو رشوت اور ساتھ میں سفارش ہو گی تو ہی ڈگری کی وقعت تسلیم کی جائے گی ورنہ ڈگری کاغذ کا ٹکڑا ہی ثابت ہو گی جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

پھر بہت سارے دن بیت گئے؟ ایک دن وہ مجھے فٹ پاتھ پر کھڑا نظر آ گیا اور میری توقع کے عین مطابق اسی پرانی وضع کا لباس اس کے جسم پر سجا، اس کے حالات کا تسلسل بیان کر رہا تھا۔ غربت اور بے روزگاری جس کے اہم جز تھے۔ نا چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کے قریب بریک لگا دیئے، وہ ایک لمحے میں مجھے پہچان گیا۔ میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تو اس نے قدرے سلیقے سے اِنکار کر دیا کہ ابھی بس یا ویگن آ جائے گی۔ میں نے اسے اصرار کر کے بٹھا لیا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال اُٹھ رہے تھے جو میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن بات کا سرا نہیں مل رہا تھا آخر اس نے ہی خاموشی توڑی۔

"آپ کے دوسرے دوستوں کا کیا حال ہے؟"

"ملے نہیں کبھی۔" میں نے صاف گوئی سے کہا اور فوراً ہی سوال داغ دیا۔ "سنا تھا فائزہ کے بارے میں بڑا۔"

"پاگل تھی وہ خواہ مخواہ بلا سوچے سمجھے ایک ایسی راہ پر چلنا چاہتی تھی جہاں گڑھے اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔"

"ایسی بھی کیا بات تھی؟"

"میری اپنی مجبوریاں ہیں، مجھ پر بوجھ ہیں، ذمے داریاں ہیں۔ مجھے ان سے فرصت ملتی تو اس کا دکھ پال سکتا تھا اور پھر ہر کام وقت کے مطابق کرنا چاہئے جبکہ وہ وقت سے پہلے حالات کو قابو میں کرنا چاہتی تھی۔"

"معذرت خواہ ہوں میں، آپ کی بات سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھ سکا۔"

"میں نے کوئی مشکل بات تو نہیں کہی، سیدھی سی بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکے اور لڑکی کے تعلق کا آغاز اور انجام شادی تصور کیا جاتا ہے۔ میں اس سے تعلق بڑھاتا تو بات منگنی اور پھر شادی تک جاتی تھی۔ میں فی الحال یہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں خود بے روزگار ہوں، اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ بیمار ماں کے علاج، چھوٹی بہن کی شادی کے اخراجات پورے کرنا ہیں، چھوٹے بھائیوں کو پڑھانا ہے۔ اتنے عرصے میں وہ بوڑھی نہیں ہو جائے گی کیا؟"

آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ ذرا ہنس دیا تھا۔ تبھی میرے اندر انسانی ہمدردی نے جوش مارا۔ "اگر آپ کہیں تو میں کسی سفارش وغیرہ کا بندوبست کروں۔"

"نہیں......! میں ناامید نہیں ہوں۔ میرے اچھے مارکس ہیں۔ میری اکیڈمک ہسٹری شاندار ہے۔ مجھے اگر اپنے اخراجات پورے کرنے کیلئے وقت نہ نکالنا پڑتا تو شاید میں ٹاپ کر جاتا مگر مجھے اتنا وقت...... خیر مل جائے گی نوکری، بہر حال آپ کا بہت شکریہ۔"

دوسری دفعہ بھی وہ مجھے اسی طرح ایک بس اسٹاپ پر کھڑا مل گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ شکستہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس بار اس کی باتوں میں بڑی مایوسی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا۔ میرے لئے قطعاً حیرت انگیز نہ تھا، ایسا ہونا ہی تھا۔ کب تک وہ ڈگری ہاتھ میں پکڑے حالات کا مقابلہ کرتا رہتا، اعصاب چٹخنے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنی فکر نہیں میری ضرورت تو بس اتنی ہے کہ پیٹ بھر روٹی مل جائے لیکن جب اپنے بوڑھے باپ کے کھردرے ہاتھوں، فائلوں پر جھکی کمزور نظر اور نڈھال جسم کو دیکھتا ہوں تو شرمندگی کی عمیق دلدل میں دھنس جاتا ہوں۔ بوڑھی بیمار ماں اب خود مجھ سے نظر چراتی ہے۔ بہن کی جوانی دکھوں کا حصار بن کر میرے وجود کو جکڑ چکی ہے۔ بھائیوں کے تاریک مستقبل کا خوف مجھے پاگل بنا دینے کیلئے کافی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ خواہ مخواہ ہی پڑھتا چلا گیا۔ ہوش سنبھالتے ہی میرے ہاتھ میں بیچ کس پلاس ہوتا یا پھر میں کسی ہوٹل میں بیرا گیری پر مامور ہو جاتا تو آج اچھا موٹر میکینک ہوتا، کئی میرے جیسے چھوٹے میرے ہاتھ سے ہنر سیکھ رہے ہوتے یا پھر میں کسی چھوٹے موٹے ہوٹل کا مالک ہوتا۔ اب تو اس سے بھی گیا گزرا ہوں۔ میں اپنے سارے خیالات، ساری ذہانت اور ساری تعلیمی کمائی ایک طرف رکھ کر اب یہ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن زخمی روح پر مزید تیر سہنے کی سکت نہیں۔ کتابوں میں

پڑھے کالے حروف میری زندگی میں روشنی پیدا نہیں کر سکے۔ یہ تو ایک دیمک کی مانند ہیں جو روح کے ساتھ ساتھ جسم بھی چاٹتے جا رہے ہیں۔"

میں خاموش رہا اور کچھ نہ بولا وہ کہتا چلا گیا۔

"وہ لوگ مجھے بڑے عجیب لگتے ہیں جو دنیا کو بدل دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان خیالات، عزائم اور یقین سب کاغذی باتیں ہیں۔ چائلڈ لیبر پر کیئے گئے سیمینار، ورکشاپیں اور تحقیق فضول لگتی ہیں۔ کتنے بچے ورکشاپوں سے اٹھا کر اسکول میں داخل کرائے گئے ہیں۔ کتنے بیراگیری ختم کرا سکے ہیں مگر وہ تعلیم کیوں حاصل کریں جس کا مستقبل ڈگری اٹھا کے دھکے کھانا ہے۔ دوہرا معیار تعلیم ایک جمہوری معاشرے میں کیوں؟ روٹی کا چکر ایک پھندے کی طرح ہمارے گلے میں ہے۔ جس کا دوسرا سرا اسی زمین کے ناخداؤں کے ہاتھ میں ہے تو پھر۔۔۔۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا اور ایک آہ میں سارے لفظ دم توڑ گئے۔ "تعلیم فقط نوکری حاصل کرنے کیلئے تو نہیں حاصل کی جاتی۔" میں نے کمزور سی دلیل دی۔

"میں مانتا ہوں مگر ان غریب غرباء کا کیا کیا جائے جو کیڑے مکوڑوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کے پاس تعلیم کا سرمایہ ہوتا ہے جو یقیناً بے کار ہوتا ہے۔ ان کے پاس روپیہ پیسہ ہو تو انہیں تعلیم سے رغبت ہی کیوں ہو اور پھر تعلیم فقط چند کتابیں پڑھ لینے کا نام نہیں۔ بگاڑ تعلیم کا نہیں اور نہ ہی غریب میں صلاحیتیں کم ہوتی ہیں بلکہ بگاڑ تو ان لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے جو حقدار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ تعلیم کی صحیح تعریف نہ جاننے والے تعلیمی بورڈ کے کرتا دھرتا ہیں۔ ہوس کے بندے مفاد کا لہو چاٹ رہے ہیں۔"

میں نے اسے پاگل اور بے مصرف سمجھ کر سڑک کے کنارے اُتار دیا کہ یہ بھی لفظوں کی دلدل میں پھنس گیا ہے پھر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا کبھی کبھار وہ یاد آ جاتا تو میرا تصور مجھے بڑے عجیب منظر دکھاتا میں دیکھتا، وہ کسی فٹ پاتھ پر پڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ اس کی وہ وجاہت اور جوانی معاشی عفریت نے نگل لی ہے۔ کبھی سوچتا وہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے حالات کی چکی میں پس رہا ہوگا یا پھر رشوت حاصل کرنے کے نت نئے طریقے سوچنے میں اس کا وقت گزرتا ہوگا تاکہ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کیا جا سکے یا پھر وہ کسی ایسے گروہ کے ساتھ شامل ہو گیا ہوگا جو اغوا برائے تاوان، ڈکیتی یا قتل جیسے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہوں گے یا شاید کہیں مر کھپ گیا ہوگا۔ خودکشی کر لی ہوگی۔

یہی تو المیہ ہے اس لوئر میڈل کلاس طبقے کا یہ لوگ زیادہ تر خوابوں اور خواہشوں کی اُنگلی پکڑ کر چلتے ہیں۔ ماں بیٹے کو "بڑا آدمی" دیکھنا چاہتی ہے۔ باپ محنت کرتا پاگل ہو جاتا ہے کہ اولاد کی روٹی پوری ہو جائے۔ اس کے ہر طرح کے سکھ کے احساس کے عوض وہ اپنے مستقبل کا سہارا بنانے کی فکر میں ہوتا ہے، بہنوں کی آس بنتا ہے۔ رشتوں کی زنجیر میں جکڑ کر رہ جاتا ہے۔ پیٹ پالنا مجبوری بن جاتا ہے۔ ان کی خواہشیں چھوٹی، خوشیاں چھوٹی، لیکن غم دکھ اور ذمے داریاں بڑی بڑی ہوتی ہیں۔

اس بار جب میں نے اسے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکا۔ وہ مشہور فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خوبرو حسینہ کے ساتھ جدید تراش کے ڈنر سوٹ میں بیٹھا کم از کم مجھے وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہا تھا۔ میز پر امپورٹڈ سگریٹ اور نفیس ترین لائٹر کے ساتھ موبائل فون پڑا تھا۔ اس کی وجاہت بھی لوٹ آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تاثر تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا، شاید سکون تھا یا اطمینان۔ میں خود اس کی طرف

بڑھا بلکہ کھنچتا چلا گیا۔ حسب سابق وہ فوراََ ہی مجھے پہچان گیا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے اس خوبرو حسینہ کا تعارف اپنی دوست کی حیثیت سے کرایا۔ کافی دیر تک باتیں ہوتیں رہیں پھر یہ سوال اس وقت زبان سے پھسل ہی گیا جب وہ حسینہ اٹھ گئی۔

''یہ تبدیلی کیوں اور کیسے؟''

اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مختصراً یوں سمجھ لو کہ میں نے جان لیا ہے کہ میں جنگل میں رہ رہا ہوں اور یہاں قانون بھی طاقت والے کا ہے پھر میں نے راز پا لیا کہ طاقت کیسے حاصل کی جاتی اور یہ طاقت کس چیز میں ہے اس کیلئے مجھے پہلے پہل اپنی انا اور خوداری کی قیمت دینا پڑی جن کی حیثیت یہاں دو کوڑی بھی نہیں ہے۔'' اس نے رُک کر سگریٹ سلگائی اور دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''میں اس جنگل میں کتے کی طرح روٹی کی تلاش میں پھرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اور بہت سے کتے بھی ہیں جو قصائی کی دوکان تک جا پہنچتے ہیں اور وہاں سے ہڈی اُٹھا کر چوستے ہیں اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اس جنگل میں بھیڑیئے بھی ہیں جن کی خوراک زندہ گوشت ہوتا ہے جنہیں وہ جھنجھوڑتے ہیں۔ میں ایسے ہی گوشت کا بیوپاری بن گیا ہوں جو کچھ دیر کیلئے رہن رکھا جاتا یا یوں سمجھ لو کہ جیسے گوالہ دودھ حاصل کرنے کیلئے بھینس پال لیتا ہے یا کوئی انڈے حاصل کرنے کیلئے مرغیاں، بالکل اسی طرح میں نے چند جسم پال لئے ہیں جن کی حیثیت بھینس یا مرغی سے زیادہ نہیں لیکن میری تجوری بھر رہی ہے، اب میں انسان نہیں رہا، میری روح اور ضمیر مردہ ہیں۔ میں خواہشوں کا غلام وہ جانور ہوں جو اس جنگل میں اسی طرح زندہ رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش ہوا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اور ہاں! اگر آپ کو کسی سفارش کی ضرورت ہو تو مجھے کہیے گا۔''

اور میں سوچنے لگا کہ اپنے نئے پروجیکٹ کیلئے جو سرمایہ قرض لینا ہے اس کیلئے اس کی خدمات حاصل کر لوں۔

صلیبِ وقت

وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھی مسلسل باہر گھور رہی تھی۔ بظاہر اس کی نظریں ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔ مگر وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچ کا سرا اس فنکشن کی یاد سے شروع ہوا جو رات یونیورسٹی میں بہت دھوم اور جوش و خروش سے ہوا تھا۔ اس فنکشن میں اس کے ڈیپارٹمنٹ کا الگ سے پروگرام تھا۔ وہ سارے ساتھی جنہوں نے پورے دو سال ساتھ گزار دیئے تھے۔ ایک دوسرے سے بچھڑتے ہوئے ایک نامعلوم سے دکھ کے حصار میں آ گئے تھے۔ ان میں کسی کی کسی سے بے تکلفی بھی تھی۔ کوئی ایک دوسرے کا دوست اور کوئی ان میں ایسا بھی تھا جو چہرے کی حد تک شناسا کہا جا سکتا تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے نام اور رول نمبر تک معلوم نہیں تھے مگر اس وقت سب اپنے اپنے لگ رہے تھے۔ ان میں سہیل بھی تھا۔ جو اسے ہمیشہ سے ہی منفرد لگا تھا وہ مسلسل اسے گھورتا رہا تھا اور وہ اسی تسلسل سے ڈسٹرب ہوتی رہی تھی۔ آج وہ ہمیشہ کی طرح فریش نہیں تھا اور نہ ہی اس کی باتوں میں وہ روانی تھی۔ بس خاموش خاموش سا تھا۔ اگر کوئی بڑھ کر اس سے بات کر لیتا تو اس کا مختصر سا جواب دے دیتا ورنہ یونہی بد دل مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ایک طرف بنے ہوئے اسٹیج پر سب اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ طرح طرح کی آوازیں میوزک اور نجانے کیا بلا گلا۔ یوں تو الوداعی تقریب تھی ہی مگر یوں لگتا تھا جیسے سہیل نے کچھ زیادہ ہی محسوس کی ہے۔ جیسے یہاں بہت کچھ چھوڑ کر جا رہا ہو۔ وہ بھی اس کے پاس گئی تھی۔ اسے یاد نہیں اس نے سہیل سے کون سا رسمی جملہ کہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک اس کے چہرے کو تکتا رہا تھا۔ وہ جھینپ گئی اور پھر بات نہ کی۔ تبھی وہ اسٹیج کی جانب بڑھا اور مائیک اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سہیل نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں پھر کہنے لگا۔

میں ٹھیک سے تری چاہت تجھے جتا نہ سکا
کہ میری راہ میں حائل تھے مسئلے تیرے
یہ درد کم تو نہیں کہ تو ہمیں نہ ملا
یہ اور بات ہے کہ ہم بھی نہ ہو سکے تیرے

وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنا چاہ رہی تھی۔ پھر فنکشن کے اختتام تک وہ ایک نامعلوم سے دکھ کی کسک محسوس کرتی رہی۔

☆☆☆

سہیل اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ اس نے اسی دن اس کے خوابوں پر تسلط جما لیا تھا جب وہ لائبریری کی سیڑھیاں اتر رہی تھی اور وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر اس کے ہاتھوں میں پکڑی کتاب پر پڑی تو وہ رک گیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”خاتون یہ کتاب آپ کب تک لائبریری میں جمع کرا دیں گی؟“

"کیوں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"عجیب اتفاق ہے کہ میں بھی کتاب لینے لائبریری کی طرف آ رہا تھا۔" اس نے بڑے شائستہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پہلے آپ پڑھ لیجئے میں بعد میں پڑھ لوں گی۔" اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"اوہ..... ! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں آپ سے کتاب ہی چھین لوں۔ آپ نے پہلے کتاب ایشو کروائی ہے اس لئے پہلے آپ کا حق بنتا ہے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا، اگر آپ نے برا محسوس کیا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔" اس نے کہا اور آگے بڑھنے کیلئے قدم بڑھا دیئے۔

وہ جلدی سے بولی۔ "پلیز ذرا ٹھہریئے۔" وہ رک گیا۔ "میں یہ کتاب کل ہی واپس کر دوں گی۔"

"شکریہ۔" اس نے اتنا ہی کہا اور لائبریری کی طرف بڑھ گیا۔

وہ سارا دن اس کے بارے میں سوچتی رہی اور وہ رات پہلی تھی جو اس کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ اس کا ٹھہرا ٹھہرا لہجہ، بالوں کا خوبصورت اسٹائل، لباس اور سے اٹھتی بھینی بھینی مہک، یہ اس سے پہلی ملاقات کا پہلا تاثر تھا، اور اس تاثر نے اس کی دنیا اتھل پتھل کر دی تھی پھر کلاس میں ایک ساتھ پڑھنے کے دوران میں اس کی مزید خوبیاں اسی طرح کھلتی چلی گئیں۔ اس کی ذہانت سے جہاں ساتھی طالب علم متاثر تھے، استاد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر کسی کے ساتھ اس کے مزاج و معیار کے مطابق بات کرنا، پھر یوں ہوا کہ وہ اس کے قریب آتا چلا گیا۔ دنیا جہاں کے موضوعات پر بحث کا طویل سلسلہ ہوتا۔ ایک ایک موضوع کئی دن چلتا۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ دوستی کی حد ختم ہو چکی ہے اور اب وہ اس سرحد میں داخل ہو چکی ہے جہاں ادھوری باتیں اچھی لگنے لگتی ہیں۔ لفظ کھوکھلے اور بے تاثر ہو جاتے ہیں۔ خاموشی زبان بن جاتی ہے۔ خواہشیں نیا روپ لے لیتی ہیں۔ خواب رنگین ہو جاتے ہیں۔ دل ایک نئی لے پر دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے اور فطرت اپنے تمام گہرے رنگ کے ساتھ عیاں ہونا شروع ہو جاتی ہے تب کئی دنوں تک آنکھ مچولی چلتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو جذبے وہ اپنے اندر محسوس کر رہی ہے اور جن سے اسے اپنی دنیا کے بدل جانے کا احساس ہو رہا ہے کہیں کسی کمزور لمحے میں سہیل کے سامنے ان کا اقرار نہ کر بیٹھے۔ وہ سہیل کے لیے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھنے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو آگ اس کے اندر جل چکی تھی وہ اس آگ میں تنہا ہی جلنا چاہتی تھی۔ شاید وہ جذبوں کی بارش میں بھیگی ہوئی کبھی اس سے اقرار کر ہی بیٹھتی مگر سہیل بھی کسی سورج کی طرح اس کی نگاہوں کو خیرہ کیے رکھتا۔ اس کی دنیا میں اپنے ہونے کے احساس کی تمازت بکھیرتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی اس سے اشارتاً اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا وہ بھی اسے چاہتا ہے۔ اس جیسی آگ میں وہ بھی جل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی نیند کا بوجھ لیے پھرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جذبوں کا اظہار نہ کر سکی۔ ایک جھجک سی تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی تھی اور جب وہ اپنے بوڑھے باپ پر نگاہ ڈالتی تو سہیل کی محبت جانے نہیں دل کے کس کونے میں سمٹ کر پوشیدہ سی ہو جاتی اور اس کی جگہ باپ کی محبت لے لیتی۔ اس کا باپ ہی اس کیلئے سب کچھ تھا۔ ماں بن کر پالا اور اسے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ممتا اس کیلئے نایاب جذبہ ہے۔ اس کے باپ کی محبت تھی جو یوں اپنی جوانی کو پس پشت ڈال کر بیٹی کی تربیت کرتے چلے گئے۔ وہ تمام آسائشیں اس کیلئے مہیا کیں جس کی وہ تمنا کرتی اور اب ان کی دنیا وہیل چیئر پر بیٹھے گھر کے دالان، کمرے اور لان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ پوری دنیا سے کٹ کر رہ گئے تب اس نے محسوس کیا کہ اب اسے باپ کی شفقت و محبت ہی نہیں

سینا بلکہ اب اس کے باپ کو اس کی محبت اور خدمت کی بھی ضرورت ہے۔ گویا اب اس کے باپ کی تمام دنیا اس میں سمٹ کر رہ گئی تھی اور یہی وفا کا تقاضا بھی تھا۔

اس کے باپ نے گھر میں ہی اپنا آفس بنالیا اور کاروبار کو سنبھال لیا۔ وہ صبح صبح اٹھتی اور اپنے ابا کی بیڈ تک پہنچا آتی پھر انہیں لان لے جاتی۔ کچھ دیر ان کے ساتھ رہنے کے بعد اخبار تھما کر خود ناشتہ بناتی۔ ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتی پھر تیار ہو کر یونیورسٹی چلی جاتی۔ دوپہر واپسی پر اپنے باپ کے ساتھ کھانا کھاتی۔ ان سے تھوڑی گپ شپ کرتی اور آرام کر کے پھر اپنے باپ کے ساتھ چائے پیتی۔ تب اپنے باپ سے سارے دن کی روداد سنتی جو تقریباً روزانہ ایک جیسی ہی ہوتی۔ ڈنر کے بعد انہیں دوائی کھلا کر بیڈ پر لٹا دیتی اور پھر اس کی اپنی دنیا اسے اپنی طرف بلانا شروع کر دیتی۔

اس کے دو چار رشتے آئے بھی تھے، لیکن باپ کے منظور کر لینے پر بھی اس نے سختی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کو یوں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود تو اپنی دنیا بسا لے اور اپنے باپ کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

☆☆☆

"بیٹا آج تمہاری خالہ آئی تھی۔" جہاں آرا بیگم نے سہیل سے کہا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بینک سے لوٹا تھا اور کھانا کھا کر آرام کی خاطر بیڈ پر پڑا تھا۔

"کیوں امی؟" سہیل نے بے پروائی سے پوچھا۔

"یہ کہنے آئی تھیں کہ وہ اب نزہت کی شادی کیلئے تیار ہیں تاکہ پھر صباحت اور راحت کے بارے میں سوچ سکیں۔"

جہاں آرا بیگم نے وہی بات کر دی تھی جس کا اسے پہلے ہی احساس تھا اور اس ذکر سے ہمیشہ ہی بچا کرتا تھا۔ اب انہوں نے یہ بات کہی تو کسمسا کر رہ گیا جب وہ کافی دیر تک چپ رہا تو انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ "پھر کیا کہتے ہو تم۔"

"امی میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"واقعی درد ہے یا بہانہ بنا رہے ہو؟" امی نے کہا تو اس نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔

"ہاں امی میں بہانہ بنا رہا ہوں۔ آپ کو میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا، اور میں نے آپ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ آپ خالہ کو کہہ دیں کہ وہ نزہت کی شادی کسی اور جگہ کر دیں پھر اب باقی کیا بات رہ جاتی ہے؟"

"بیٹا وہ تمہاری بچپن کی منگیتر ہے۔ تمہاری خالہ کیا کہیں گی؟ نزہت پر کیا گزرے گی؟ رشتے دار، برادری والے باتیں بنائیں گے۔ کچھ تو خیال کرو۔"

"کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ نزہت ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کیلئے رشتوں کی کمی نہیں ہوگی اور اب پلیز مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کیجئے گا۔ میں نزہت ہی سے نہیں، کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا، یہ میرا فیصلہ ہے اور اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"پھر میں انہیں کیا جواب دوں اور کیسے دوں؟" امی نے زچ ہوتے ہوئے کہا تو وہ غصے سے بولا۔

"آپ کوئی بھی بات نہ کریں ان سے، میں ہی کوئی ایسا جرم کر لیتا ہوں کہ وہ خود جواب دے دیں۔" اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"عجیب لڑکا ہے۔" اس کی ماں اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ صحن میں پیڑ کے نیچے چارپائی پر آ کر لیٹ گیا اور اس کی سوچوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

ہاں ایک عجیب لڑکا ہی ہوں شاید اس لیے کہ میں نے اس عمل سے بغاوت کی ہے جس سے عام لوگ گزرتے ہیں۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ عام لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔ جو ایک گھسے بندھے عمل سے گزرتے ہیں۔ ذرا ہوش سنبھالا تو ماں باپ کو حالات کی چکی میں پستے ہوئے دیکھتے رہے۔ انہیں اپنی غربت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن بچوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوانا چاہتے ہیں۔ وہ بچوں کو اسکول بھیج دیتے ہیں اور بچے جب اپنے ہی جیسے گوشت پوست رکھنے والے دوسرے بچوں کو اچھی صحت اور اچھے لباس میں دیکھتے ہیں تو یا تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں یا حسد کی آگ میں جھلسنے لگتے ہیں۔ پھر وہ ناآسودہ خواہشوں کے بھنور میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا حصول ان کیلئے خواب بن جاتا ہے پھر وہ گھٹتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کی تمنائیں، ارمان، خواہشیں، سب کچھ کھلی کھلی آنکھوں کے خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ وہ کسی اعلیٰ درجے کے اسکول میں نہیں پڑھا تھا جہاں ایک ماہ کی فیس ان کے گھر کے پورے مہینے کا خرچہ ہوتی ہے۔ وہ ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھا مگر پھر بھی رہتا تو اس معاشرے میں تھا جہاں کسی کے بڑے ہونے یا چھوٹے ہونے کا معیار فقط دولت ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد اعلیٰ نوکری اسی کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے باپ نے کتنی محنت سے دو کمروں پر مشتمل ایک گھر بنایا تھا۔ ساری پونجی لگا کر بھی قرض لینا پڑا تھا پھر بھی ایک طرف بنا کچا کمرہ ان کی غربت کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ غربت ایسے چکر میں ڈالتی ہے کہ پھر سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کا بوڑھا باپ اب ریٹائرمنٹ کے بالکل قریب تھا اور ایک بہن تین بھائیوں کا مستقبل اس کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ کالج کی تعلیم مکمل کر چکا تھا تو بنا باپ کے کچھ کہے یہ بات جان چکا تھا کہ اب اس کے باپ میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مزید تعلیم دلوا سکے۔ وہ احتجاج نہیں کر سکتا تھا لیکن مزید تعلیم کا شوق اس کے سامنے تھا۔ ناامیدی کے ماحول میں اب تو اس کا خواب ہی تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ پارٹ ٹائم جاب کر کے اپنے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے لگا۔ اس نے اپنی ضروریات کو بڑی حد تک سمیٹ لیا تھا۔ اس کے پاس فقط ایک ہی زندگی تھی لیکن چار زندگیاں اس کے ساتھ بندھ چکی تھیں۔ بہن کی شادی کرنا تھی، چھوٹے بھائیوں کو تعلیم دلوانا تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بہن کی شادی کر دے تو بھائیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دے گا۔ وہ بھائیوں کا مستقبل روشن دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔ یہ بھی اس کا خواب تھا کہ شعیب ڈاکٹر بنے، رضا انجینئر اور منصور کے بارے میں ابھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا لیکن اس کو بھی بڑا آدمی بنانے کا خواب اس کی آنکھوں میں جھلملاتا رہتا تھا اور اس کی اپنی سب سے بڑی تمنا تھی کہ باہر جا کر تعلیم حاصل کرے اور اس مقام تک پہنچے جہاں کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ وہ اکثر سوچتا یا تو اسے غریب گھرانے میں پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا یا ایسے خواب نہیں دیکھنا چاہئے تھے جو ایک روگ کی طرح چمٹ کر رہ گئے تھے۔ یہ خواب پورے ہونے کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اسے احساس تھا کہ اگر اس نے اپنے خوابوں کی تعبیر پانا ہے تو اس کی قیمت بھی چکانا ہوگی۔ سے اگر کچھ پانا ہے تو کچھ کھونا بھی پڑے گا۔ تبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی نہیں کرے گا۔ اسے یہ یقین تھا کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی کیونکہ اسے یہ حصار

توڑ نا تھا۔ فرہاد بن کر اس پہاڑ کو اپنی محنت کے تیشے کو چور چور کرنا تھا۔ غربت کو مات دینے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے نزدیک شادی کوئی منزل نہیں تھی بلکہ زادِ راہ تھی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ زادِ راہ بھی اس کیلئے بوجھ ہو گی۔ ایک پرسکون اور آسائش بھری زندگی کے حصول کیلئے اسے بہر حال محنت کرنا پڑے گی اور بھائیوں کو اگر وہ غربت سے نکال لایا تو آنے والی نسل احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہو گی۔ وہ آنے والی نسل کا دُکھ ابھی محسوس کر رہا تھا۔ نا اُمیدی کی کیفیت کا جو دکھ وہ سہہ رہا ہے انہیں نہ سہنا پڑے اور اس کیلئے کسی نہ کسی کو تو قربانی دینا ہی تھی اور اس کیلئے وہ خود تیار تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور اپنا بوجھ خود اُٹھا لیا۔ اس احساس نے اسے حوصلہ مندی اور جرأت سے بھر دیا۔ اس کے خیال میں محنت لازمی شے تھی۔ جوانی کو وہ محنت کیلئے ہی مختص سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں جوانی کے دو حصے ہوتے ہیں جن میں سے ایک حصے میں ضرور محنت کرنا پڑتی ہے۔ اب یہ خود اس انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس حصے میں محنت کرتا ہے اگر وہ پہلے حصے میں محنت کرتا ہے تو دوسرے حصے میں آسودگی اس کا اعزاز ہو گی لیکن اگر وہ پہلے حصے کو گنوا دے تو دوسرے میں بہر حال اسے محنت کرنا پڑے گی اور پچھلے حصے کا خراج بھی اسے ادا کرنا پڑے گا پھر وہ محنت کا علم لے کر نکلا تاکہ غربت کو مفتوح بنا لے، پوری خود اعتمادی کے ساتھ۔

انسان کو خود کو چاہئے جتنا مضبوط بنا لے لیکن کوئی نہ کوئی لمحہ اس کی زندگی میں در آتا ہے۔ اور ان لمحوں کو کمزور کر دینے میں جذبات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ کمزور لمحے دراصل اسی مضبوطی کا امتحان ہوتے ہیں اور پھر محبت جیسا خوبصورت جذبہ تو خودرو کسی تیزی سے پھیلنے والی بیل کی طرح انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ سہیل بھی اسی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ کئی دنوں سے ثمینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منفرد سی، بڑی بڑی آنکھوں والی معصوم سی دلکش لڑکی جس کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی۔ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جو نئے ماحول کے باعث سہمی سہمی تھیں مگر وہ بڑی پر اعتماد تھی۔ اپنی خوبصورتی کے باعث وہ سہیل کی آنکھوں میں سما گئی تھی۔

پہلی ملاقات سے لے کر رات کی الوداعی تقریب تک جو دورانیہ انہوں نے یونیورسٹی کے ماحول میں گزارا اس کیلئے کشش کا باعث ضرور رہا تھا۔ ثمینہ اس کے اس حد تک قریب آ گئی تھی کہ وہ اس کی مہک اپنی سانسوں میں محسوس کرنے لگا تھا۔

اس رات جب الوداعی تقریب اپنے عروج پر تھی وہ ثمینہ کے دھواں دھواں چہرے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ دو سال کی طویل رفاقت سے وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ثمینہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اگرچہ اس نے یہ جتایا نہیں تھا مگر لاشعوری طور پر اس نے یہ احساس دلایا تھا۔ عام حالت میں اگر وہ اس کیلئے اپنے دل میں کوئی بھی جذبہ نہ رکھتا تو شاید وہ بھی محسوس نہ کر پاتا۔ وہ اسے اپنے من میں بسا تو چکا تھا لیکن کی جرأت اسے یکسر نہ تھی۔ غیر مرئی زنجیروں میں جکڑا وہ حالات کا قیدی، خود ہی اظہار پر تعزیرات لگا چکا تھا۔ اس نے ثمینہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی اور یہی جاننا غضب ڈھا گیا۔ آسائشوں میں پلی وہ معصوم سی لڑکی اس کے چھوٹے سے گھر میں کس طرح گزارا کر سکے گی؟ نہیں وہ اسے کسی امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔ پھر اس نے رات جاتے سے دکھ کی شدت کو شعروں میں بیان کر دیا وہ اپنے کیے پر شرمندہ نہیں تھا۔ اس نے ثمینہ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ کوئی عہد نہیں باندھا کوئی پیمان نہیں کیا، اور ثمینہ نے بھی کبھی ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی سو وہ اس رات بچھڑ گئے۔

☆☆☆

''سہیل بھائی مجھے یہاں کی ایک کمپنی کی طرف سے ٹھیک ٹھاک آفر ہوئی ہے۔اس بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے جوائن کر لوں یا باہر چلا جاؤں؟'' یہ منصور تھا جو چارٹرا کاؤنٹینٹ بن چکا تھا۔

''ارے منصور! کب تک میری انگلی پکڑ کے چلتے رہو گے۔اب تم عملی زندگی میں قدم رکھنے جا رہے ہو۔خود اعتمادی پیدا کرو اپنے آپ میں......خود فیصلے کرو اب۔''

اس نے پیار سے کہا تو منصور اس سے لپٹ گیا۔پھر سر اُٹھا کر بولا۔''میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ یہاں سہی پھر باہر ٹرائی کروں گا۔فارغ رہنے سے یہی بہتر ہے۔''

''اچھا جلدی سے منہ ہاتھ دھولو اور پھر بچی کو سیر کرالاؤ۔کافی دیر سے ضد کر رہا ہے بلکہ سبھی کو لاد کر لے جاؤ ذرا گھما پھرا لاؤ۔''

''جی اچھا۔'' منصور تو یہ کہتا ہوا اندر چلا گیا اور وہ لان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو بڑی شفقت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔اسماء اور جنی شعیب کے بچے تھے اور خضر، رضا کا بیٹا تھا۔وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔''اگر اس کے اپنے بچے ہوتے تو!'' یہ خیال اسے بہت آتا لیکن وہ یہی کہہ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا کہ یہ سب بھی تو میرے ہی بچے ہیں۔مجھے تایا ابو کہتے ہیں۔مجھ سے پیار کرتے ہیں۔میرے پاس سوتے ہیں۔کوئی چیز مانگنا ہو تو میرے پاس آتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی در آتا کہ اگر میرے بچے ہوتے تو وہ بھی یوں ہی میرے پاس آتے، میں بھی ان سے انتہائی پیار کرتا۔ایک پھانس سی اس کے گلے میں اٹک جایا کرتی پھر وہ اپنے اردگرد سب کی محبتوں میں اپنے وجود کو بھلا دینے کی کوشش کرتا۔وہ سب بھی تو ہر کام اس کے مشورے کے مطابق کرتے ہیں حتیٰ کہ گھر میں کھانا تک پکانے میں اس کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے، لیکن ایک بے چینی سی اور بے سکونی کی حالت اس پر طاری ہو جاتی۔اس کے خوابوں کی تکمیل تقریباً ہو گئی تھی۔اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔اس نے اپنے بھائیوں کو روشن مستقبل کی طرف گامزن کر دیا تھا، پرسکون اور پرآسائش زندگی گزارنے کے لوازمات فراہم کر دیے تھے مگر خود تنہائی کے حصار میں بری طرح جکڑ گیا تھا۔زندگی نے اس سے اپنا خراج وصول کر لیا تھا وقت اپنی قیمت لے چکا تھا۔اسے تنہائی اور بے سکونی میں مبتلا کر دیا تھا اور پھر وہ بری طرح کام میں مصروف ہو جاتا اور خود سے بیگانگی اسے قدرے پرسکون کر دیتی۔اب وہ اپنی تنہائی سے قدرے مانوس ہو گیا تھا اور زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل نکلی تھی اچانک اس کی زندگی اک نیا روپ لے کر اس کے سامنے آگئی۔

''سہیل بھائی! میں نے ایک زبردست فیصلہ کیا ہے کیونکہ آپ ہی نے اس کی اجازت دی تھی اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ میں نے ایک کنواری ادھیڑ عمر خاتون سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔وہ بہت دولتمند ہے اور اس کا سارا بزنس شادی کے بعد میرا ہو گا۔''

''کون ہے وہ؟'' سہیل نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ اس کی خواہش ہے کہ نکاح سادگی سے ہو گا۔آج شام ہمارا نکاح ہے۔کل میں اس سے آپ کو ملوا دوں گا لیکن بہرحال اس کی تصویر میرے پاس ہے یہ دیکھیں۔''

سہیل نے عینک لگا کر تصویر پر نگاہ ڈالی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔وہ ثمینہ ہی تھی۔تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔اس کے تصور میں

بھی نہیں تھا کہ ثمینہ اس کے سامنے یوں آ جائے گی۔ اذیت کی ایک لہر اس کے وجود میں درد بن کر پھیل گئی۔ اس نے تصویر منصور کو واپس کر دی۔ وہ تو چلا گیا لیکن سہیل نے یہ محسوس کیا کہ اس کی زندگی میں دور تک اندھیرا پھیل گیا ہے۔ اب تنہائی کے ساتھ ساتھ ایک مسلسل اذیت بھی اس کی ہم سفر ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے مسافر صدیوں کی مسافت کے بعد اچانک منزل سامنے آنے پر بے دست و پا اور مجبور ہو جائے، چلنے کی سکت اور قوت گویائی تک چھن جائے۔ وہ آبلہ پائی میں دکھ کا صحرا عبور تو کر ہی رہا تھا۔ شدت کی پیاس ہوتے ہوئے بھی اس نے لبوں کو تر نہیں کیا تھا۔ مگر اب یہ اذیت بھی سہنا مقدر بن گئی کہ نخلستان سامنے ہو لیکن کسی اور سرحد میں جو ممنوعہ ترین علاقہ ہو۔ ”نہیں۔ منصور کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اب وہ اپنے دامن میں اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ ایک اور اذیت بھری صلیب کا بوجھ خود پہ لاد لے۔ منصور کو روکنا ہوگا۔“ پھر وہ مشینی انداز سے اُٹھا اور باہر کی سمت گیا۔ منصور کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پوری قوت سے اسے آواز دی۔ منصور حیران سا اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگا اور پھر جلدی سے اس کے قریب آ پہنچا۔

”سہیل بھائی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں میری طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن تم۔ تم ثمینہ سے شادی نہیں کر سکتے۔“ اس نے پھولی ہوئی سانس کے دوران کہا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اس سے ضرور شادی...... مگر آپ کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”بس میں نے کہہ دیا ہے کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔“

”نہیں بھائی میں اس سے شادی سے کسی طرح بھی نہیں رُک سکتا۔ آپ نے شادی نہ کر کے اپنے خوابوں کی تکمیل چاہی ہے لیکن میں نے شارٹ کٹ مارا ہے۔ آپ نے شادی نہیں کی یہ آپ کا فیصلہ تھا۔ میں شادی کر رہا ہوں یہ میرا حق ہے۔“ منصور نے سر جھکا کر کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھائی سے نگاہ نہیں ملا رہا تھا۔ ”چلو پھر ٹھیک ہے۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔“ اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے سہیل بھائی...... اس سلسلے میں، میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے دولت کی طلب تھی، اور ہے مگر میں آپ کی طرح اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا...... پلیز آپ۔“ آگے اس نے کچھ بھی نہ کہا اور سر جھکائے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے لمحے ہی وہ بل کھاتی سڑک پر جا رہا تھا۔

وہ دل سے اٹھتے ہوئے درد کو محسوس کرتے ہوئے وہیں ستون کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔ تبھی رضا کی بیوی باہر آئی اور اسے یوں بے دم سا دیکھ کر سہارا دے کر کرسی پر بٹھانے لگی۔ وہ مسلسل پوچھے جا رہی تھی کہ کیا ہوا جو یوں آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ تب اس نے ثمینہ سے تعلق کو چھپاتے ہوئے بتایا کہ منصور کیا کرنے جا رہا ہے۔

”ہاں سہیل بھائی......! اس نے مجھ سے بھی ذکر کیا تھا وہ اس کمپنی کی مالک ہے جس میں منصور کام کرتا ہے۔“

اس کا پتہ پاتے ہی سہیل جلدی سے اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف گیا سائیڈ ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور پھر تیز رفتاری سے ثمینہ کے گھر جا پہنچا۔ وہ جب ثمینہ کے ہاں پہنچا تو وہ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر سہیل پر پڑی وہ جلدی سے اُٹھ گئی۔ وہ اسے حیران نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پہچان کے سارے رنگ اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

”ثمینہ!“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”کیسی ہو؟“

”کیسی ہو سکتی ہوں تمہارے خیال میں۔“ ثمینہ نے ہاتھوں میں پہنی چوڑیوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''اسی طرح جس طرح میں ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں میں؟'' ''شاید۔''

''شاید نہیں یقیناً تم بھی اب تک ایسے کرب میں مبتلا رہی ہو جس میں میں رہا ہوں اور یہی میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ جو تم کرنے جا رہی ہو...... اس سے تمہیں تو قدرے سکون مل جائے گا مگر میرے کرب میں دوگنا اضافہ ہو جائے گا۔ پلیز منصور سے شادی کا خیال ترک کر دو۔ وہ میرا بھائی ہے چھوٹا۔'' تب ثمینہ زور سے ہنس دی۔ ہنستے ہنستے وہ یکدم رکی اور کہنے لگی۔ ''منصور نے جو کہا وہ پورا کر دیا۔ سہیل! اس نے تمہاری تصویر نجانے میرے کمرے میں کیسے دیکھ لی تھی اور مجھ سے اس کی بابت پوچھا، میں نے اسے غلط سلط بتایا لیکن آخر اس نے مجھ سے یہ پوچھ کر کے میں نے کس یونیورسٹی اور کس سیکشن میں پڑھا ہے حقیقت اگلوا دی۔ میں زندگی سے سمجھوتہ کر چکی تھی مگر وہ مجھے شادی پر مجبور کرنے لگا۔ آخر میں اس کی بات پر راضی ہو گئی کہ اب بھی یہ شخص مجھے چاہتا ہو تو میں شادی کر لوں گی اور اس نے تمہارا امتحان لینے کی خاطر یہ سارا ڈرامہ رچایا۔''

''کیا...... ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ منصور...... اوہ منصور...... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''مگر تم...... بھی......'' وہ سر اٹھا کر اسے تکنے لگا۔

''میں بھی...... میں بھی اب تک تم سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''نہیں...... اب نہیں رونا۔ اب ہم مل جائیں گے۔ ہم شادی کریں گے، دھوم دھام سے۔'' وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ ''دو...... دو بوڑھوں کی شادی دھوم دھام سے۔''

''تم ہنستے ہوئے اب بھی اتنی ہی حسین لگتی ہو جتنی یونیورسٹی کے دنوں میں لگتی تھی۔'' پھر رک کر بولا۔ ''میں نے تو اپنے مستقبل کو بہترین بنانے کی خاطر جوگ لیا تھا مگر تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

تو ثمینہ نے آہستہ سے کہا ''پھر وفادار کیسے کہلاتی میرا مان میری وفا ہی تو تھی۔ یہ میری وفا کی تپسیا ہی تھی کہ آج تم میرے سامنے ہو۔'' وہ یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

اور سہیل اس وفاداری کی دیوی کو احترام کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہ سنا ہی تھا کہ عورت وفا کا دوسرا نام ہے اور آج وہ اس عورت کو دیکھ بھی رہا تھا پھر خاموشی کے کتنے ہی طویل لمحے گزر گئے اور اچانک منصور کی آواز نے گہری خاموشی کو توڑ دیا۔

''آیئے مولانا صاحب! ایک مولانا آگے بڑھے اور پھر ان کے پیچھے ہی سب گھر والے آ گئے۔ سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ سہیل کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''ڈرامہ تو میں نے رچا لیا بھائی! اب اس کا ڈراپ سین مولوی صاحب کریں گے، لیکن اس سے پہلے دونوں بھابیوں کو یہ حکم جاری کیا جاتا ہے کہ وہ بھابی ثمینہ کو جلدی جلدی تیار کریں۔ نکاح آج شام ہو گا اور کل شام دھوم دھام سے دعوت ولیمہ ہو گا۔ جس کی اطلاع میں فون پر سب ملنے والوں کو دے دوں گا۔'' اس کی تقریر پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ وہ سب ثمینہ کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ثمینہ نے محسوس کیا کہ وہ وقت کو مات دے کر سرخرو ہو گئی ہے۔

❀❀❀

بابا گجی؟

تاحدِ نگاہ سنہری ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ سہ پہر کی طلائی دھوپ میں ریت کا سمندر بڑا پُر اسرار دکھائی دے رہا تھا۔ اُفق تک بھوری ریت تھی۔ جہاں سے گہرا نیلا آسمان شروع ہو جاتا تھا۔ درمیان میں کہیں سبزہ نہیں تھا۔ پُر ہول سناٹے میں ہوا شور مچاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس قدر بھیانک ویرانی تھی کہ وحشت ہو رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ ان دنوں بہار کا موسم تھا۔ گرمیاں اگر ہوتیں تو یہاں رہنا اک عذاب سے کم نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کے نگاہیں اس طرف پھیر لیں، جہاں کنٹینروں اور کینوس کی چھولداریوں سے ایک بستی اُگ آئی تھی۔ تب بے اختیار میرے سینے میں گھٹی ہوئی سانس یوں آزاد ہوئی جیسے کبوتر کو ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔ میں اُدھر چل دیا۔

ہم ایک غیر ملکی کمپنی کے تحت اس صحرائی علاقے میں گئے تھے۔ وہاں جا کر یوں لگا جیسے ہم پوری دنیا سے کٹ گئے ہیں۔ ہم نے جہاں کیمپ لگایا تھا وہ ٹیلوں میں گھری ہوئی قدرے صاف زمین تھی۔ قریب ہی ایک کچی سڑک تھی۔ جو شمال میں تقریباً بائیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ تک لے جاتی تھی۔ ہفتہ وار چھٹی کے دن ہی ہم کمپنی کی گاڑی میں اس قصبے تک جاتے۔ تب ہمیں یقین ہوتا کہ ہم بھی اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں ایک اکلوتا پی سی او تھا۔ جہاں سے بڑی کوشش کے بعد ہم اپنے گھر والوں سے رابطہ کر پاتے تھے۔ ہمارے کیمپ کے جنوب میں ایک چھوٹی سی مقامی لوگوں کی بستی تھی۔ اس بے آب و گیا صحرا میں یہ کچی بستی غنیمت تھی۔ ہمارے وہاں ہونے سے انہیں بڑا معاشی فائدہ ہوا تھا۔ وہاں کے نوجوان ہمارے ساتھ کام میں شامل ہو گئے تھے۔ جس سے ان کی اچھی مزدوری بن جاتی۔ ہماری بھی کھانے پینے کی کافی ضروریات وہیں سے پوری ہونے لگیں۔ خصوصاً وہاں کا خالص دودھ ہمیں میسر آنے لگا۔ وہ نوجوان صبح صبح آ جاتے، سارا دن کام کرتے اور شام کو اپنی بستی پلٹ جاتے۔ چند دنوں میں ان سے خاصی مانوسیت ہو گئی۔

میری وہاں پر ایک سپر وائزر کی حیثیت سے نوکری تھی۔ میرے ماتحت مقامی مزدوروں سمیت پندرہ سے بیس افراد کام کرتے تھے۔ پہلے پہلے میرے لئے وہاں کام کے علاوہ بوریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر چند دنوں کے بعد ہی ان مقامی مزدوروں کی وجہ سے یہ کیفیت نہ رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان میرے ساتھ کام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ میں بھی ان میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ میری دلچسپی کی وجہ ان کی آپس کی گفتگو تھی۔ وہ اکثر کسی بابے گجی کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ جیسے ہی بابے گجی کا ذکر آتا یا اس حوالے سے کوئی بات کرتا تب وہ کھلکھلا کر ہنس دیتے۔ بابا گجی کے حوالے سے بات کر کے وہ بہت مزہ لیتے۔ مجھے تجسس ہونے لگا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ بابا گجی کون ہے اور اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے؟ کیا انہوں نے کسی اشارے کے لئے کوئی اصطلاح گھڑی ہوئی ہے، یا واقعتاً کسی بابے کا کوئی وجود ہے؟ دن بدن میرے لئے تجسس بڑھتا گیا۔ آخر ایک دن جب آرام کا وقت تھا اور سب آرام کر رہے۔ میں نے ان مقامی مزدوروں میں سے زیادہ سمجھدار لڑکے سانول کو بلا لیا۔ وہ جھجکتے ہوئے میرے

خیمے میں آ گیا۔ میں نے اسے سوڈے کی ٹھنڈی بوتل پینے کو دی۔ پھر اس سے مقامی بودوباش وغیرہ کے بارے میں گپ شپ کرنے لگا۔ اس دوران میں نے بابے گپی کے بارے میں پوچھ لیا۔ پہلے تو اس نے شرمندگی سے میری جانب دیکھا پھر کھسیانی سی ہنسی میں بولا۔

"او سائیں! اس کا کیا ذکر کرنا۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔" میں نے اصرار کیا۔

"کیا کریں گے اس کے بارے میں پوچھ کے۔۔۔ ایویں بس۔۔۔" وہ اس ذکر سے بچنا چاہتا تھا۔ اب جبکہ میں نے بات چھیڑی تھی اس لئے تھوڑی بہت معلومات تو لے لینا چاہتا تھا۔

"یار جیسا بھی ذکر ہے، تم بتاؤ۔" میں ذرا سے سخت لہجے میں کہا تو وہ بولا

"سائیں! ہماری بستی میں ایک بوڑھا بابا رہتا ہے۔ اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔"

"مگر جب بھی تم لوگ اس کا ذکر کرتے ہو تو۔۔۔"

"وہ ایسا ہے نا سائیں کہ وہ باتیں بڑی عجیب عجیب سی کرتا رہتا ہے۔ جس کو سنا سے سمجھ آتی ہے اور نہ ہمیں۔"

"سنا سے سمجھ آتی ہے نہ تم لوگوں کو۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟" میں دبی دبی حیرت سے پوچھا۔

"وہ ایسی باتیں کرتا ہے، جس کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر" اس نے ہولے سے بتایا۔

"وہ کوئی ذہنی مریض ہے؟" میں نے کریدا

"نہیں نہیں سائیں! کبھی کبھی تو وہ بڑی سیانی باتیں کرتا ہے۔ اصل میں وہ بولتا ہی کم ہے۔ پھر جب باتیں کرتا ہے تو سیانی باتیں کرتے کرتے اچانک پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ وہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔" اس نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"مطلب وہ کیسی باتیں کرتا ہے؟" میں نے الجھتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا

"کیا بتاؤں سائیں! کوئی کام کی بات ہو تو کہوں۔" اس نے پھر سے پہلو تہی کرنا چاہی۔ مگر میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس لئے کہا

"میں نے دیکھا ہے تم لوگ اکثر اس کا نام لے کر ہنستے رہتے ہو۔ کوئی خاص وجہ ہوگی جبھی تم لوگ۔۔۔"

"سائیں بات یہ ہے وہ ایسی بے ڈھنگی اور فضول بات کرتا ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ سب اسے بابا گپی ہی کہتے ہیں۔ لیکن جو بات وہ کرتا ہے، وہ گپ بھی نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں کیا کہتا رہتا ہے۔" اس نے بے مزہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا وہ جیسی بھی بات کرتا، اسے چھوڑو۔ تم مجھے اس کی کوئی ایک بات بتاؤ۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ تو وہ خیالوں میں کھو گیا جیسے کوئی بات منتخب کر رہا ہو۔ پھر بولا

"اس کی ایک بات بتاتا ہوں سائیں۔ ایک دفعہ مچھلی کے شکار کی بات چل نکلی۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے کبھی زندگی میں مچھلی کا شکار نہیں کیا ہوگا۔ ہر کوئی اپنا قصہ یا واقعہ سناتا رہا۔ جس میں کچھ سچ تھا کچھ جھوٹ تھا۔ ہر کوئی اپنی باری پر بات کرتا رہا۔ جب بابے کی باری

آئی اس تو کمال کر دیا۔" وہ سانس لینے کے لئے رُکا اور پھر کہتا چلا گیا" کہنے لگا تم لوگوں نے کیا شکار کیا ہوگا۔ شکار تو میں نے کیا تھا۔ میں دریا کے پل پر کنڈی لگائے بیٹھا تھا۔ ابھی اتنا زیادہ وقت نہ ہوا تھا کہ ایک مچھلی میری کنڈی میں لگ گئی۔ میں نے اسے باہر نکالنا چاہا تو وہ نہ نکلی۔ آخر میں ڈور پل کے ساتھ باندھی اور خود دریا میں چھلانگ لگا دی۔ تاکہ دیکھوں تو سہی معاملہ کیا ہے؟ میں نے نیچے پانی میں جا کر دیکھا تو مچھلی کم از کم چالیس فٹ کی تھی۔" اتنا کہہ کر سانول رک گیا۔

"اچھا پھر۔۔؟" میں نے تیزی سے پوچھا

"سائیں۔ ابات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ کہنے لگا۔۔۔ میں نے اس مچھلی کو دریا سے باہر نکالنا چاہا مگر وہ نہ نکلی۔ میں دریا سے باہرا گیا۔ قریب ہی کنارے پر ملاحوں کی کشتیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کشتی اور چند غوطہ خور مزدور لئے۔ دریا میں اس جگہ آیا تو مچھلی کانٹا نکالنے میں ابھی ہوئی تھی۔ میں نے مزدوروں کی مدد سے اس مچھلی کو کشتی میں لاد کر کنارے پر لے آیا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رُک گیا تو میں نے کہا

"پھر۔۔۔!"

"پھر کہنے لگا کہ اتنی بڑی مچھلی دیکھ کر لوگ کافی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس مچھلی کو گھر کیسے لے کر آؤں۔ میں نے وہ اسے وہیں بانٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی اس کا پیٹ چاک کیا گیا، اس میں ہی ایک زندہ بلی نکلی۔ میں نے اس پکڑنا چاہا مگر وہ چھلانگ لگا کر بھاگ گئی۔ بس میں نے وہ مچھلی وہیں بانٹی اور گھر آ گیا۔" اس نے اپنی بات مکمل کر کے یوں اطمینان بھرا سانس لیا جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

"سائیں! یہ کیا بات ہوئی؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں خود حیران رہ گیا تھا۔ یہ تو خوابوں کی اصطلاحوں اور اشاروں جیسی باتیں تھیں۔ جس کی نہ کوئی منطق، نہ کوئی دلیل، نہ وجہ اور نہ کوئی جواز تھا۔

"وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا

اس دن کے بعد سے میرا تجسس کم ہونے کی بجائے مزید بڑھ گیا۔ وہی ایک بات میرے ذہن میں گھومتی رہی۔ اس پر میں سوچتا بھی چاہتا تو کوئی ایسا سرا میرے ہاتھ نہ لگتا کہ جس کے سہارے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکتا۔ ان مقامی نوجوانوں میں ایک نوجوان جندوڈا نامی بھی تھا۔ ایسے ہی ایک دن وہ میرے پاس بیٹھا تھا۔ یونہی گپ شپ کے دوران بابا گپی کا ذکر آ گیا۔

"یار جندوڈا! اس کی کوئی گپ سناؤ۔" میں نے تجسس سے کہا۔

"گپ۔۔۔! گھوڑ کو سائیں۔ خیر میں ایک سناتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا، "بابا گپی کو اس علاقے میں آئے کوئی پانچ چھ سال ہوئے ہیں۔"

"کیا وہ شروع سے یہاں نہیں رہتا۔ میرا مطلب وہ مقامی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا

"نہیں! بزرگ کہتے ہیں کہ سانپ، شیر اور درویش کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اب وہ پتہ نہیں کیا ہے۔ نجانے وہ کہاں سے آیا ہے۔ پانچ چھ سال ہوئے بستی کے باہر وہ چھپر ڈال کر اس میں رہتا ہے۔ کسی نے کچھ کھانے کو دے دیا تو کھا لیا ورنہ یونہی پھرتا رہتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں

مانگتا۔ اس کے چھپر کے سامنے ایک بڑا سا درخت ہے۔ جس کی بڑی گھنی چھاؤں ہے۔ بوڑھے اور فارغ لوگ اکثر وہیں جا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ چاہے وہاں ہو نہ ہو۔ کبھی کبھار ہمارا دل کرتا ہے گپیں سننے کو تو ہم بھی چلے جاتے ہیں۔ کبھی اس نے ذکر نہیں کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ پر اس کے آنے سے بستی میں رونق بہت ہے۔" اس نے اچھی خاصی معلومات دے دی۔

"وہ تم اس کی کوئی گپ سنانے لگے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا

"ہاں۔! ایک دن کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بات اسی صحرائی علاقے کی سیاحت بارے چل نکلی، جہاں ہم آباد ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ عمریں گذر جاتی ہے اس کو پورا دیکھنے کے لئے۔ تب بابا جی نے بڑے اعتماد سے بتایا کہ وہ ستر سال پہلے اس پورے علاقے کی سیر کر چکا ہے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہیں بیٹھے ایک بوڑھے نے کہا کہ چند دن پہلے تم نے اپنی عمر ساٹھ سال بتائی ہے۔ کیا تم پیدا ہونے سے پہلے ہی اس علاقے کی سیر کر چکے ہو؟"

"پھر، اس نے کیا جواب دیا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا

"عمر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا لیکن بڑی ہی سنجیدگی سے بولا کہ جس کا جی چاہے مجھ سے پوچھ لے۔ میں بتا دیتا ہوں کہ کہاں پر کیا ہے۔" اس نے مزہ لے کر بتایا

"پھر پوچھا تم لوگوں نے۔۔۔؟" میں نے جلدی سے پوچھا

"نہیں۔! اس کی بات کو یونہی گپ سمجھ کر ہوا میں اُڑا دیا۔" وہ بولا۔

"اوہ۔!" میں نے ایک خیال کے تحت بڑے افسوس سے کہا۔ پھر کچھ دیر تک بات کرتے رہنے کے بعد ہم اپنے کام کے لئے اُٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جندوڈا اپنے ساتھی سانول سے زیادہ باتونی اور صاف گو ہے۔

میرے ذہن میں بابا جی کے بارے میں مزید تجسس در آیا۔ آخر وہ کیسا آدمی ہے۔ میں اکثر اس کے بارے میں یونہی سوچتا رہتا۔ اور میرے ذہن میں اُوٹ پٹانگ باتیں گھومتی رہتیں۔ ایسے ہی ایک دن جندوڈا سے مجھے نہ صرف بابا جی کے بارے میں تازہ گپ سننے کو ملی بلکہ نئی معلومات بھی ملی۔

"سائیں، آج میں آپ کو ایک تازہ گپ سناتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی بوتل کو غٹاغٹ پی کر خالی کرتے ہوئے، ایک طرف رکھ کر کہا۔

"بولو۔۔!" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"بابا جی کے پاس یونہی گپ شپ کے دوران پالتو جانوروں کی بات ہونے لگی۔ ہر کسی نے اپنی بات کی۔ جب بابے کی باری آئی تو پتہ ہے اس نے کیا کہا؟" اس نے بات کرتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولا

"تم ہی بتاؤ۔" میں نے کہا

"کہنے لگا، میرے پاس ایک ایسی نسل کا کتا تھا، جو رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کا قد گائے کے بچھڑے جتنا تھا۔ وہ میں

نے رکھوالی کے لئے نہیں بلکہ لڑائی کے لئے رکھا تھا۔ وہ کتا تین سال تک زندہ رہا۔ اس دوران اس نے کوئی مقابلہ نہیں ہارا۔"

"یار جندوڈا۔! یہ تو عام سی باتیں ہیں۔ اس میں کوئی گپ والی بات تو نہیں۔ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں سائیں۔! میں جو کہنے والا ہوں وہ تو سنیں نا۔" اس کے لہجے میں اک ذرا احتجاج چھلک پڑا۔ میں خاموش رہا تو وہ کہتا چلا گیا: "کتوں میں جتنی اچھی خصوصیات ہوتی ہیں وہ ساری اس میں تھیں گپ والی بات یہ ہے کہ بقول بابا جی کے، وہ کتا انسانوں کی طرح بولتا تھا۔" اس نے اپنی بات تیزی سے مکمل کر کے گہری سانس لی اور پھر میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اپنی بات کا ردعمل جاننا چاہتا ہو۔ اب میں اس پر کیا کہہ سکتا تھا۔

اس دن جو دوسری بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اسے پنجاب کے ایک شہر ساہیوال سے بہت اُنسیت تھی۔ بابے کے مطابق اس شہر کی ہر شے اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ ساہیوال سے اس کی جذباتی قسم کی محبت تھی۔ جیسے لاہور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کے جن کنوؤں سے معشوق پانی بھرتے ہیں وہ میٹھے ہیں باقی سب کھارے ہیں۔ اس طرح جس شے کے ساتھ ساہیوال کا نام جڑا ہے۔ وہ سب سے اچھی ہے۔ حتیٰ بابا جی نے اگر کبھی اپنی سائیکل ٹھیک کروائی تھی تو ساہیوال سے۔ اس کے جیسے کاریگر کہیں نہیں پائے جاتے۔ بقول بابا جی "میں صبح سائیکل لے کر نکلتا ہو میل کا سفر کر کے، سائیکل مرمت کروا کے، شام کو واپس آ جاتا۔"

چند ہفتوں کے بعد میں نے بھی ذہنی طور پر مان لیا کہ وہ اگر دنیا کا سب سے بڑا گپ باز نہیں ہے تو کم از کم اس صحرائی علاقے کا سب سے بڑا گپی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے ایک بات اور بھی محسوس کی۔ وہ مقامی نوجوان آپس میں مذاق کرتے ہوئے بابا جی کا نام لیتے اور قہقہہ لگا کر ہنس دیتے۔ انہی لمحات میں مجھے خیال آتا کہ یہ کہیں دوسروں کو بے وقوف تو نہیں بناتے؟ اور ان کا پہلا نشانہ میں ہوں۔ ممکن ہے بابا جی کا وجود ہی نہ ہو، کوئی فرضی کردار گھڑ رکھا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انہوں نے کسی خاص اشارے یا استعارے کے لئے بابا جی کی اصطلاح وضع کی ہوئی ہو۔ تب میرے دل میں اس بابے سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ ایک تو مقصد یہ تھا کہ اس کی وجود کی تصدیق ہو جائے، دوسرا یہ بھی تھا کہ دیکھوں تو سہی کیا واقعی وہ ایسی باتیں کرتا ہے۔ جس طرح ساتول اور جندوڈا وغیرہ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔ لیکن وقت تھا کہ ملتا ہی نہیں تھا۔ شام کو تھکن سے بدن چور چور ہوا ہوتا تھا۔ اس وقت تو بس آرام کرنے کی سوجھتی تھی۔ یا پھر چھٹی کے دن نزدیکی قصبے میں جانا ہوتا تھا تاکہ اپنی گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کر لی جائے۔ وہاں بھی خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ یوں باوجود خواہش کے میں بابا جی کو دیکھنے اور اس سے ملنے نہ جا سکا۔

اس صحرائی علاقے میں ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہمیں وہاں آئے ہوئے پانچ ہفتے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ ایک دن اچانک ہیڈ کوارٹر سے مجھ سمیت چند آدمیوں کو واپس بلوا لیا گیا۔ وہ ہمیں کسی اور پراجیکٹ کے لئے بھیجنا چاہتے تھے۔ ہماری جگہ کام کرنے کے لئے جو لوگ، جس گاڑی میں آئے تھے۔ ہمیں اسی پر واپس جانا تھا۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی فوری طور پر جانے کیلئے تیاری کر لی۔ میرے پاس ایک بیگ تھا اور بس۔ جس وقت ہم وہاں سے چلے تو دوپہر ڈھل کر سہ پہر سے مل رہی تھی۔ تب اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ میں بابے جی سے تو ملا ہی نہیں

ہوں۔ اس سے ملنے کے لئے میرے دل میں بڑی شدت سے خواہش ابھری۔ مگر اتنے مختصر وقت میں کیسے مل سکتا ہوں۔ اگر اس کی بستی راہ میں ہوتی تو کچھ دیر رک جاتے۔ تاہم میں نے ایک کوشش کرنے کی ٹھان لی۔

گاڑی کے ڈرائیور کا نام عرفان تھا۔ وہ میرا اچھا خاصا شناسا تھا۔ میں نے اس سے بات کی۔ وہ اس شرط پر مان گیا کہ باقی لوگوں کے تیار ہو جانے تک ہم واپس آجائیں گے۔ میں نے اسے گاڑی لانے کو کہا اور خود ان مقامی نوجوانوں کے پاس چلا گیا۔

''سائیں، آپ اس وقت یہاں کیسے؟'' جندوڈا نے پوچھا۔ انہیں ہمارے جانے کی خبر ہو گئی تھی۔

''میں اس وقت تمہاری اس بابے سے ملنے جا رہا ہوں۔'' میں نے پرسکون انداز میں کہا تو وہ حیرت اور تذبذب میں بولا

''پتہ نہیں۔۔۔ پتہ نہیں سائیں وہ ملتا بھی ہے یا نہیں اس وقت۔۔۔''

اس کے یوں کہنے پر میرا شک یقین میں بدلنے لگا کہ یہ لوگ اب تک جھوٹ بولتے آئے ہیں۔

''چلیں دیکھتے ہیں، مل گیا تو ٹھیک، ورنہ میری قسمت'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''چل سانول۔۔۔ تو انہیں لے جا''

''نہیں یار تو لے جا'' جندوڈا نے جلدی سے کہا

''ہم سب چلتے ہیں۔'' میں نے یہ کہہ کر ان کی مشکل حل کر دی۔

کچھ لمحوں میں وہاں گاڑی آ گئی۔ ہم اس میں سوار ہوئے اور بستی کی جانب چل دیئے۔ دوران سفر وہ سب خاموش تھے۔ اس وقت وہ صحرا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نجانے اتنے دن یہاں رہنے کی وجہ سے قربت کا احساس ہو گیا تھا۔ ہمارے سفر کا اختتام ایک جھونپڑی کے پاس ہوا، جسے مقامی زبان میں ''گوپا'' کہتے ہیں۔ وہاں باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک گھنا درخت تھا۔ جس کے آس پاس کافی ساری زمین ایسے صاف تھی، جیسے ابھی کسی نے وہاں آ کر بیٹھنا ہو۔ ایک طرف صف لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس کی پاس ہی دو گھڑے، جن پٹ سن کی بوری کے ٹکڑے لپیٹے ہوئے تھے تا کہ پانی ٹھنڈا رہے۔ ہم وہاں جا کر رک گئے۔

''پتہ نہیں وہ اندر ہے بھی کہ نہیں۔۔۔ کہا نا کہ وہ سیلانی بندہ ہے۔'' جندوڈا نے تشویش سے کہا۔

''تو آواز تو دے۔'' سانول نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر زور سے آواز دے دی۔ ''بابا بوٹے۔۔۔!''

دوسری آواز پر ایک شخص جھونپڑی میں سے نمودار ہوا۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی خاص تاثر نہیں دے سکا۔ چھوٹے سے قد کا کالا بھجنگ سا شخص تھا۔ سر سے آدھا گنجا، سفید بال یوں الگ سے دکھائی دے رہے تھے جیسے گوند سے چپکائے گئے ہوں۔ اسی طرح چھوٹی سی بے ترتیب داڑھی اور بھاری مونچھیں جو اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ان گھنی مونچھوں کے درمیان سے جھانکتے موٹے موٹے سیاہ ہونٹ عجیب سا تاثر دے رہے تھے۔ تیکھی ناک آگے سے ذرا سی مڑی ہوئی تھی۔ اس کی ننھی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ یوں جیسے چیتے کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ چہرے اور سر کی نسبت کان بڑے تھے۔ اس نے سفید براق دھوتی

اور کرتا پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کا جوتا پہنے ہوئے تھا جس کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی سری لنکن لگتا تھا۔ کرکٹر جے سوریا سے اس کی بہت حد تک مشابہت تھی۔ اس لئے وہ مجھے سری لنکن لگا تھا۔ یا پھر ایسا بنگالی جس نے دریا کے علاوہ زمین ہی نہ دیکھی ہو۔

"بابا بولنے۔۔۔ یہ تم سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔" جندوڈے نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ تب اس نے پہلے مجھے سرتا پا غور سے دیکھا اور پھر وہ اپنے قد سے زیادہ بھاری آواز میں بولا

"کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

بلاشبہ میرے پاس جو متوقع جواب تھا وہ میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں اس کوئی مصلحت آمیز جواب دینا چاہ رہا تھا کہ سانول جلدی سے بولا

"دوسرے تم سے کیوں ملنے آتے ہیں۔ کبھی کسی چنگے بندے سے بھی مل لیا کر۔" اس کا لہجہ کافی حد تک ہتک آمیز تھا۔ جسے میں نے تو محسوس کیا مگر بابے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بابا شاید مسکرایا تھا۔ بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

"آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ بیٹھو" یہ کہہ کر وہ صف بچھانے لگا۔

"ہم نے اتنی دیر نہیں بیٹھنا، بس چند منٹ۔۔۔۔" میں نے کہا

"اُو جناب بیٹھو۔" اس بار اس نے بڑی لہر میں کہا تو میں صف پر بیٹھ گیا۔ تب اس نے پوچھا۔ "باتیں تو ہوتی رہیں گیں، سنائیں میں کیا سیوا کروں کیا کھائیں پئیں گے۔" اس نے کہا تو میں نے پہلے سے سوچی ہوئی بات کہہ دی۔

"آپ شاید ہماری سیوا نہ کرسکیں اس لئے تھوڑی دیر۔۔۔۔"

"آپ حکم تو کریں۔۔۔" اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا

"تو پھر آپ ہمیں ساہیوال میں موجود چاچے فضل دین حلوائی کے لڈو کھلا دیں۔" میں نے کہا تو بابے نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر بڑے گھمبیر انداز میں بولا

"اچھا، چل وہی کھلا دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور گوپے کے اندر چلا گیا۔ اس پر وہ مقامی نوجوان کھسیانی ہنسی میں ہنسنے لگے اور سرگوشیوں میں نجانے کیا کچھ کہتے رہے۔ وہ چونکہ ذرا فاصلے پر کھڑے تھے۔ اس لئے ان کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ میں نے بابے کو گوپے کے اندر گئے جب دس بارہ منٹ سے زیادہ ہوگئے تو سانول کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا

"سائیں چلیں؟"

"ابھی ٹھہرو، بابا اندر گیا ہے اسے واپس آلینے دو پھر چلتے ہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا

"اس نے اب کیا باہر آنا ہے۔ آپ نے فرمائش ہی ایسی کردی ہے۔" جندوڈا نے دھیرے سے کہا

"چلو دو منٹ اور دیکھتے ہیں پھر واپس چلتے ہیں۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا اور گوپے کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ مجھے افسوس

ہونے لگا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ایسی فرمائش کر دی۔ اتنی دیر میں اس سے باتیں کر کے کچھ تھوڑا بہت خود اندازہ لگا لیتا کہ وہ کیسی باتیں کرتا ہے۔ بہر حال چند منٹ بعد میں مایوس ہو کر وہاں سے جانے کے لئے اُٹھ گیا۔ اس وقت میں صف سے اُٹھ کر جوتی پہن چکا تھا جب بابا گوپے میں سے نمودار ہوا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس کے ہاتھ میں نے چاچے فضل دین حلوائی کی دوکان کی مخصوص چھاپ والا گتے کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں دیکھا۔

''معاف کرنا جوان۔! مجھے دیر ہوگئی۔ دوکان پر تو رش نہیں تھا مگر اس بازار میں لڑائی ہوگئی تھی۔ ایک بندہ بڑا زخمی ہوگیا۔ بس ان کی لڑائی ختم کراتے دیر ہوگئی۔ آؤ بیٹھو۔۔۔ کھاؤ۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ میرے ساتھ وہ مقامی نوجوان بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، جب اس نے ڈبے کا ڈھکن اتارا اور اس میں سے تازہ ورق لگے لڈو دکھائی دیئے۔

''جی۔۔۔!'' میں جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا تو میرے ساتھ وہ نوجوان بھی بیٹھ گئے۔ ہم نے ایک ایک لڈو اُٹھا کے کھایا۔ جبکہ بابا کہہ رہا تھا۔

''یہ آج ہی تازہ لڈو بنے ہیں۔ مجھے خود بہت پسند ہیں۔ اور پھر ساہیوال تو ساہیوال ہے اس کی تو ہر شے اعلیٰ ہے۔''

''کیوں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر بڑے جذب سے بولا

''یہ تمہیں اس وقت پتہ چلے گا جب تم کہیں فنا ہو جاؤ گے۔''

اس وقت میں اس کی بات بالکل نہیں سمجھا تھا لیکن لہجے سے مرعوب ضرور ہوا تھا۔ مجھے جلدی تھی۔ عرفان بار بار گھڑی پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کر رہا تھا۔

''اچھا بابا جی اجازت۔۔۔!'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ تب وہ بھی کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہولے سے بولا۔

''سنو۔! منظروں میں نہیں اُلجھتے، ان کی روح کو دیکھتے ہیں۔ اس طرح انسان بھی اُلجھا ہوا ہے۔ جس دن اُسے اپنی سمجھ آگئی، اسی دن پوری کائنات اس کے تابع ہو جائے گی۔ حالانکہ اسے بتا دیا ہوا ہے کہ یہ کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ مقامی نوجوان وہیں رہ گئے تھے

قریبی قصبہ آ جانے تک میں اس بابے کی بات میں کھویا رہا۔ شام ہو جانے کی وجہ سے مغربی اُفق نارنجی ہو رہا تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کی جانب رواں تھے۔ میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ واپس آتے ہوئے صحرائی منظر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہاں کی ویرانی مجھے باتیں کرتی محسوس ہونے لگی تھی۔

''یار۔! گھر فون کر کے بتا دیں، پھر چلتے ہیں۔'' میرے ایک ساتھی نے کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ میں بھی اس کے ساتھ پی سی او تک چلا گیا۔

ساہیوال میں میرا ایک دوست انور علی رہتا تھا۔ وہ بجلی سے چلنے والی اشیاء کا مکینک تھا۔ اس کی اسی بازار میں دوکان تھی، جہاں چاچے

فضل دین حلوائی کی دوکان تھی۔ میں نے اسے فون کر دیا۔ حال احوال کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"آج تمہارے بازار میں کوئی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ جس میں کوئی آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا؟"

"ہاں یار، یہ دو تین گھنٹے پہلے کا واقعہ ہے۔" اس نے بتایا تو میں نے اضطراری انداز میں فون بند کر دیا۔ تب سے لے کر اب تک، میرے ذہن میں یہی سوال ہے کہ کیا وہ واقعی تھی تھا؟

شیلف میں رکھی کتاب

وہ کسی اجنبی کی طرح میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور کتاب پر نظر رکھے۔ لیکچر سننے لگی۔ میں محسوس ہی نہ کر سکا کہ وہ کب تک مجھے سب سے منفرد اور اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ نہ تو بلا کی حسین تھی اور نہ ہی ایسی کہ جسے دیکھتے ہی دل دھڑکنا بھول جائیں۔۔۔ بعض لوگوں میں ایک خاص کشش ہوتی ہے، وہ ہزار لوگوں کے اجتماع میں بھی منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ چالیس پینتالیس کی کلاس میں فقط سات لڑکیاں تھیں اور وہ ان میں سے ایک تھی۔ شروع دن سے ہی وہ عام لڑکیوں کی مانند سہمی سہمی اور ڈری ہوئی نہیں تھی۔ چند لڑکے اس کی جانب بڑھے بھی لیکن وہ کسی کے ساتھ بھی نہ گھل سکی اور پھر کسی نے اس کی جانب توجہ ہی نہ دی، اس کی حیثیت شیلف میں رکھی کتاب کی مانند ہو گئی جس کے سرورق کو تو ہر کوئی دیکھتا لیکن کوئی نہیں چاہتا تھا کہ پڑھے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود پر اک خول تان لیتے ہیں، یہ خول وہ خود اپنے آپ بنا لیتے ہیں یا ماحول ان پر بن جاتا ہے۔ وہ اس خول کے عادی ہو جاتے ہیں کہ باہر نکلنا پسند ہی نہیں کرتے۔ شاید اس خول کی وجہ ان کے اپنے اندر ہی کا خوف یا کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ جس کو چھپانے کی خاطر وہ ایسا کرتے ہیں۔ مگر اس لڑکی پر کوئی خول نہیں تھا، اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کی یہ خوبی اس طرح عیاں ہوئی کہ دوسری لڑکیاں تو اک دفاعی انداز اختیار کیے ہوئے تھیں، انہیں خوف کھائے جا رہا تھا کہ لڑکے انہیں نیچا دکھانے کی فکر میں ہیں۔ مگر اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ کسی موضوع پر اگر بات کرتی تو پھر کرتی ہی چلی جاتی۔ فقط ایک شفاف ندی کی مانند بہتے۔ لیکن جب خاموش ہوتی تو جھیل کی مانند لگتی، جس کی گہرائی کا اندازہ مشکل معلوم ہوتا۔ اسے اگر دور سے پہچانا ہوتو اپنی چال سے پہچانی جا سکتی تھی، جسے میں کبھی کوئی نام نہیں دے سکا۔ وہ کبھی ہرنی کی مانند لگتی اور کبھی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس کی بھاری، موٹی اور لانبی چوٹی پنڈولم کی طرح جھول کر اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔

پھر تھوڑا وقت گزرا، ایک دوسرے کے بارے میں جان پہچان ہوئی تو تعلق کے سلسلے بننے لگے۔۔۔ یوں ہوتا ہے نا! کہ بہت سارے لوگ جب ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو ہم انہی کے ساتھ زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں جن میں کچھ قدریں مشترک ہوں۔ یہ چاہے عادات ہوں، گفتگو ہو یا پسند و ناپسند۔۔۔ یوں ایک بڑا گروہ چھوٹے چھوٹے ذیلی گروہوں میں بٹتا چلا جاتا ہے۔ اگر قدریں ایک جیسی ہوں تو سب ایک ہی خیال میں پروئے جاتے ہیں۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو بکھری مالا کے موتیوں کی طرح چار دانے وہاں اور دو دانے وہاں اپنی الگ حیثیت میں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح مشترک قدروں کے باعث دوستیاں اور تعلق بننے لگتے ہیں۔ لڑکے اپنے ہاسٹل کی بنیاد پر یا سیاسی خیالات کی بدولت بکھر کر رہ گئے اور لڑکیاں بھی مخصوص گروہوں میں سمٹ گئیں۔ ایک میں چار، دوسرے میں ایک اور تیسرے میں فقط دو اور یہ دو لڑکیوں والا گروپ اسی کا تھا۔ ایک وہ خود تھی اور دوسری نعمانہ تھی۔

☆☆☆

قریبی پارک میں کلاس ٹور جانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی مشورہ دے رہا تھا اور کوئی مشورہ لے رہا تھا۔ لڑکیاں اپنے ذمے کام لے رہی تھیں اور لڑکے اپنے ذمے، ایک جوش تھا اور خوشی تھی۔ پروگرام تقریباً طے تھا اور میرے ذمے کام لگ چکا تو میں وہاں سے اٹھ آیا، اب وہاں سوائے گپ شپ کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں اپنی جائے عافیت کی طرف بڑھا۔ کینٹین ہی اک ایسی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ وہاں چائے، سگریٹ کے ساتھ بیٹھنے کو بہترین جگہ تھی۔ کمروں کے گھٹے ہوئے ماحول سے باہر کھلے میں جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ، وہاں اپنی مرضی کے خیالوں کی دنیا سجا کر آتے جاتے لوگوں کے چہرے پڑھ کر یا پھر اچھے اچھے لوگوں سے باتیں کرتے وقت گزار لیا جاتا تھا۔ میں کینٹین تک گیا۔ وہاں چائے کا کہہ کر سگریٹ لیے اور کونے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ مجھے وہ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان کے ایک کونے میں بیٹھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ نعمانہ تھی۔ وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ اسی لمحہ اک احساس، اک خیال در کھول کر ہوا کی طرح ذہن میں آیا کہ کیا انہیں ٹور سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ سب کے درمیان کیوں نہیں بیٹھیں؟۔۔۔ مجھے معلوم کرنا چاہیے۔۔۔ مگر کیا ضرورت ہے؟۔۔۔ خود ہی سوچ کر پھر اپنے خیال کی تردید کر کے انہیں ذہن سے نکال کر باہر لان میں اک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ایک دن بور ترین لیکچر ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، میں چپکے سے اٹھا اور کلاس روم سے باہر آ گیا۔ استاد جو باتیں بتا رہے تھے وہ میں عملی طور پر کر چکا تھا۔ ادھر ادھر جانے کی بجائے میں جائے عافیت کی جانب سیدھا گیا، چائے کا کہہ کر مڑا تو سامنے وہ دونوں آتی دکھائی دیں۔ قریب آنے پر تقریباً ایک ساتھ ہی دونوں نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا تو نعمانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہم چائے نہیں پیتیں۔۔۔ بس پیسٹری کے ساتھ جوس پی لیں گی۔" مجھے اس کا یہ بے تکلفانہ انداز بہت اچھا لگا۔

"تشریف رکھیں۔" میں نے آم کے پیڑ کے نیچے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا تو وہ ادھر چلی گئیں۔ میں آرڈر دے کر ان کے پاس جا بیٹھا تو نعمانہ بولی۔

"آپ بیشتر وقت یہیں گزارتے ہیں۔۔۔ آپ کو پڑھائی سے دلچسپی نہیں؟"

"دلچسپی ہے مگر کلاس میں دل نہیں لگتا۔۔۔ یہاں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پاس نہیں ہونا؟" پہلی مرتبہ بجائے نعمانہ کے سلمیٰ مجھ سے یوں ہمکلام ہوئی تھی۔

"پتہ نہیں۔۔۔۔" میں نے جواباً کہا تو وہ ہنس دی اور بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ یہاں یا تو لوگ پڑھنے آتے ہیں یا فقط انجوائے کرنے۔۔۔ آپ کا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟"

"یہ بھی پتہ نہیں۔۔۔ یا یوں کہہ لیں دونوں ہی یا دونوں ہی سے نہیں۔۔۔"

"بڑی مہمل گفتگو کرتے ہیں آپ۔" نعمانہ کہنے لگی۔

"ہو سکتا ہے ایسے ہی ہو۔۔۔ مگر جب اور کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو پھر جو کام کیا جائے، میرا خیال ہے اس کی افادیت بندے کی نظر

میں کم ہی ہو جاتی ہے۔ ڈگری کا حصول میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے، علم حاصل کرنا ہو تو وہ مل جاتا ہے بس پیاس ہونی چاہیے۔"

"اب بھی آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" سلمٰی بولی تو میں نے جواباً کہا۔

"اگر یہ بات میں آپ سے کروں کہ آپ کلاس میں اتنی دلچسپی کیوں نہیں لیتی تو۔۔۔؟"

"جب حد سے زیادہ حبس بڑھ جائے تو کھلی فضائیں اچھی لگتی ہیں، یہی بات ہے۔۔۔ جو چیز پڑھنے کی ہوتی ہے، ضرور پڑھتی ہوں۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی اور پھر کہتی چلی گئی۔ "اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں یا نعمانہ زیادہ لوگوں میں گھل مل کر نہیں رہتیں تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے، جو چیز اچھی لگتی ہے، اس کے حصول کی خواہش کرنی چاہیے، نہ کہ بے فائدہ اور نقصان دہ چیزوں کی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ جب چغلیاں کی جائیں، دوسروں کو برا بھلا کہہ کر اپنے اندر کی غلاظت کو چھپایا جائے تو ان لفظوں سے بدبو آنا شروع ہو جاتی ہے۔ گفتگو آلودہ ہو جاتی ہے۔ پھر ایسا پسند کرنے والا ہی وہاں بیٹھنا پسند کرے گا، دوسرا نہیں۔۔۔"

"مگر بعض دفعہ حالات اور ماحول سے مفاہمت کرنا پڑتی ہے، تب پھر ہم کیا کریں؟" میں نے کہا۔

"وہ وقت تو تب آتا ہے جب مجبوری ہوتی ہے اور مجھے کوئی مجبوری نہیں۔۔۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ انسان نے جس چیز کا نیا تجربہ کیا ہو یا پھر اس چیز کے حصول کی خواہش شدت سے ہو تب ہی اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ گفتگو کرے گا۔ فیشن، کپڑے، دوسروں کی خامیوں پر نظر، اپنی حیثیت سے زیادہ خود کو پیش کرنا، یہ باتیں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اور میں اس پر گفتگو بھی نہیں کرتی سو بور ترین مانی جاتی ہوں لہٰذا ایسے لوگوں میں بیٹھنے کا فائدہ۔۔۔۔۔۔" سلمٰی مزید کچھ کہتی لیکن نعمانہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"او خدا کی پناہ!۔۔۔ یہ کیا فلسفہ زدہ باتیں لے بیٹھے ہیں آپ۔۔۔ اور ساجد! ابھی تک وہ بوتلیں۔۔" میں اٹھا اور پھر یاددہانی کروانے چلا۔ وہیں مجھے ایک پہچان کا لڑکا مل گیا۔ اور میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ بیرا وہ چیزیں میز تک پہنچا چکا تھا۔ اس لڑکے کی بات لمبی ہو رہی تھی مگر وہ میرے انتظار میں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ نعمانہ تو باقاعدہ ہاتھ یوں ہلا رہی تھی جیسے مکھیاں اڑا رہی ہو۔ بہر حال اس سے رخصت ہو کر میں جیسے ہی ان کے پاس پہنچا تب کھانے پینے کی ابتدا ہوئی۔

"یہ پیسٹری اچھی بنی ہے، خاصی مزیدار ہے۔" وہ نعمانہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ اس لیے اچھی لگ رہی ہے کہ آپ لوگ پہلے بالکل ہی پھیکی گفتگو کر چکے ہیں۔" نعمانہ کے کہنے کا انداز اور لہجہ ایسا تھا کہ خواہ مخواہ ہی ہنسی آ گئی اور سلمٰی کا یہ پہلا قہقہہ تھا جو میں نے سنا۔ پھر یوں ہلکی پھلکی باتوں میں نجانے کتنا وقت بیت گیا۔ میں نے اوپر راہداری میں دیکھا تو سب دوبارہ نئے پیریڈ کے لیے جا چکے تھے، کوئی بھی راہداری میں نہیں تھا اور کلاس روم کا دروازہ بند تھا۔۔۔ جب ایک مزاج کے لوگ مل جائیں اور گفتگو میں کوئی اختلافی بات بھی زیرِ بحث نہ ہو تو پھر باتیں پھیل جاتی ہیں، سمٹائے نہیں سمٹتیں۔ بہت ساری ان کہی باتیں نئے سوال چھوڑ جاتی ہیں اور اک تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے۔ اس وقت کچھ ایسے ہی محسوسات تھے جب دور سے میرے دوستوں نے اشارے سے گھڑی دکھائی اور مجھے احساس ہوا کہ اب ہاسٹل جانے والی بس آنے ہی والی ہے۔ میں نے اس طرف توجہ دلائی تو وہ دونوں بھی چونک گئیں تب اگلے دن تک کے لیے ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

☆☆☆

تور سے واپسی پر میں نے نعمانہ سے پوچھا کہ سلمیٰ کیوں نہیں آئی تھی؟

"ہو سکتا ہے وہ ایسے ہنگامے پسند نہ کرتی ہو...... مجھے تو کہتی رہی تھی کہ وہ آئے گی۔" نعمانہ نے اپنی رائے دی۔ ہم نے بھی اتنی اہمیت نہ دی اور نہ ہی کمی محسوس کی تھی، بڑا ہنگامہ خیز دن گزرا تھا۔

پھر ایک دن کوئی تقریب تھی، کوئی انتظام میں لگا تھا اور کوئی اپنے اپنے تعلق کے دوستوں میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ آج ڈیپارٹمنٹ میں اک ہلچل سی تھی۔ میں ایک میگزین اٹھا کر راہداری میں آ بیٹھا تا کہ جب تک تقریب کا آغاز نہیں ہو جاتا وہیں بیٹھ کر ذرا اس میگزین کو سرسری نظر سے دیکھ لوں۔ وہ میگزین تو کیا دیکھتا تھا، ارد گرد دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے اور پھر باتیں چلتی گئیں۔ کوئی دوست بڑی اہم بات کر رہا تھا کہ یکدم سلمیٰ کی آواز میرے کان پڑی۔

"ساجد! اگر آپ کے پاس وقت ہو تو پلیز، میری بات سنئے گا۔" میں اس کی بات سننا چاہتا تھا مگر میں دوستوں کو یوں چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا لہٰذا یہ کہ کر دوست کی جانب متوجہ ہو گیا کہ میں آتا ہوں لیکن اب وہاں ماحول ہی نہ رہا تھا۔ ہر چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ اس اعتماد سے اس نے بلایا تھا اور غالباً یہ پہلی دفعہ اس طرح بڑھ کر اس نے کسی کو پکارا تھا۔

"جاؤ...... سن لو، کیا کہتی ہے؟" ایک دوست نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اتر کر سامنے لان کے پاس کھڑی تھی۔

"جی فرمائیے...... ؟"

"یہ نعمانہ کی فائل اور کتابیں ہیں پلیز، اسے دے دیجئے گا...... میں گھر جا رہی ہوں۔" اس نے فائل اور کتابیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"وہ کہاں چلی گئی اور آپ ابھی سے کیوں گھر جا رہی ہیں؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی پھر لمحہ بھر بعد بولی۔

"اسے ہاسٹل گئے کافی دیر ہو گئی ہے، ابھی تک واپس نہیں آئی...... گھر اس لیے جا رہی ہوں کہ پڑھائی تو ہو نہیں رہی، اکیلی بور ہو رہی ہوں۔"

"ابھی یہ تقریب بھی تو پڑھائی کا ایک حصہ ہے اور آپ اس میں ضرور شریک ہوں گی...... جب تک نعمانہ نہیں آتی میں آپ کے پاس بیٹھتا ہوں۔" پھر میں اس کے پاس بیٹھا بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ تقریب شروع ہو گئی تھی، نعمانہ تب بھی نہ آئی تو میں نے کہا۔

"آئیں، تقریب میں چلتے ہیں...... ہو سکتا ہے نعمانہ سیدھی وہیں چلی گئی ہو۔"

ہم دونوں ہال تک گئے، جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے بہت ساری نظریں ہماری جانب اٹھ گئیں...... نعمانہ وہیں تھی، وہ اس کے پاس جا بیٹھی اور مجھے سب سے پیچھے سیٹ ملی۔ اس دن میں نے ارادہ کر لیا کہ شیلف میں رکھی اس کتاب کو اب پڑھ لینا چاہیے۔

☆☆☆

معمول کے مطابق میس سے باہر آ کر میرے روم میٹ اور ہاسٹل کے دوستوں نے گھیر لیا۔ سب لوگوں کا اجتماعی سوال یہ تھا کہ وہ تو کسی سے بات نہیں کرتی، تمہارے ساتھ اتنا تعلق کس طرح بن گیا؟۔۔۔اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا، میں کیا کہتا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہمارے درمیان جو تعلق تھا اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ میں نے بس یہی کہہ دیا کہ وہ میری بہت اچھی کلاس فیلو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

شام ڈھلے میں اپنے کمرے پڑا "راجہ گدھ" پڑھ رہا تھا کہ میرا ایک کلاس فیلو جس سے میرا بڑا اچھا تعلق تھا آ گیا۔ بہت دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد بولا۔

"آج کل سلمیٰ کے ساتھ لمبی ملاقاتیں ہیں۔۔۔کیسی ہے وہ لڑکی۔۔۔"

"میں نے تو اسے اچھا پایا ہے۔ آپ مل کر دیکھ لیں۔"

"یہی تو بات ہے یار! میں اس سے مل نہیں سکتا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم اس سے کیسا تعلق محسوس کرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ میں نے وضاحت کی تو اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا اور کہنے لگا۔

"پتہ نہیں کیوں وہ ہمارے پاس بیٹھنا تو کجا، ہم سے بات بھی نہیں کرتی۔"

اتنا کہہ کر اس نے موضوع بدل لیا اور میں سوچنے لگا کہ ضروری نہیں آدمی کا ملنے جلنے یا تعلق ہو جانے کے بعد پتہ چلے بلکہ اس سے بھی پہلے دیکھنے کے انداز میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے، جس سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ انسان کیا چاہتا ہے۔ اور وہ نظریں مثبت انداز کی ہیں یا منفی سوچ کی غماز ہیں، پھر اسی تاثر کی بنیاد پر ہی تعلق کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

☆☆☆

میں کلاس روم سے باہر راہداری میں کھڑا آتے جاتے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا، مقصد صرف وقت گزاری تھا۔ تب ہی وہ میرے قریب آ گئی۔ میں نے اس کی آمد محسوس تو کر لی لیکن بولا کچھ نہیں۔ وہ شاید اس خاص چہرے کی تلاش میں تھی جیسے میں دیکھ رہا تھا، مایوس ہو کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"چہرے۔۔۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"چہروں میں کیا ہوتا ہے؟" اس نے بات بڑھائی۔

"بہت کچھ۔۔۔چہرے سے کوئی بھی انسان عاری نہیں، چہرہ اس کا اپنا ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔۔۔ناک، آنکھیں، ہونٹ، چہرے کی بناوٹ میں وہ عام انسانوں کی مانند ہوتا ہے لیکن دنیا بھر میں وہ ایک ہی ہوتا ہے اور وضع کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، اس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کو کس قسم کا بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے۔۔۔چہرہ انسان کا تعارف ہے۔ خاص علاقے کی نمائندگی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں بہت سارے ایسے چہرے بتا سکتی ہوں جو دیکھنے میں بڑے معصوم اور پیارے لگتے ہیں مگر ایسا چہرہ رکھنے والے لوگ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔۔۔خیر چھوڑیں ان باتوں کو، یہ بتائیں کہ گرم گرم چائے کے ساتھ پکوڑے کھانا کیسا لگے گا؟"

"اس وقت جب کہ آپ کا ساتھ ہو، بہت اچھا۔۔۔"

"تو پھر میرا خیال ہے کینٹین تک چلا جائے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دو تین دن ہو گئے، نعمانہ نہ آئی۔ میں نے سلمیٰ سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہی تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد وہ آئی تو خاصی بدلی ہوئی تھی۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ خاصا زیور پہنا ہوا تھا۔ وہ اس وقت بس کے انتظار میں پختہ روش پر بیٹھی ہوئی تھیں کہ میں قریب سے گزرا اور نعمانہ نے پکارا تو میں ان کے پاس چلا گیا۔

"پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ اتنے دنوں کہاں غائب رہیں؟" میں نے جاتے ہی سوال کیا۔

"آپ ٹھہرے غافل۔۔۔ارد گرد کی خبر آپ نے لینی نہ ہوتی۔ آپ کو کیسے پتہ چلے کہ میں کیوں نہیں آئی۔۔۔ارے بھئی میری منگنی ہو گئی ہے۔ کمال ہے صبح سے یہ سونے کی چوڑیاں کھنکنا رہی ہوں اور آپ نے پوچھنا کیا، سنا تک نہیں۔۔۔" اس نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"منگنی مبارک ہو۔۔۔کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟"

"بہت اچھا۔۔۔اک تحفظ کا احساس ہے۔ مزید اعتماد آ گیا ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا تو سلمیٰ بولی۔

"ہمیں کون سا تحفظ نہیں ہے یا ہم میں اعتماد نہیں ہے؟"

"سلمیٰ! آپ کی منگنی ہو گئی؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں۔۔"

"ہو جائے گی، یوں منہ بسورنے سے فائدہ۔۔۔؟" میں نے کہا تو ایک دم قہقہہ لگا اور قریب کھڑے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تب سلمیٰ نے کہا۔

"جب تک بس نہیں آتی آپ ہمارے پاس بیٹھیں۔۔"

"میں کھڑا ہوں آپ کے پاس۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ادھر آ کر ہمارے پاس بیٹھیں۔" میں نے انکار کیا تو وہ ضد پر اتر آئی۔

"بھئی اتنے سارے لوگ کیا کہیں گے کہ میں آپ لوگوں کے پاس بیٹھا ہوں۔۔۔"

"دیکھتے رہیں لوگ ہمیں ان کا ڈر ہے۔" تب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

بس وہی دن غضب کا تھا۔ بہت سارے لوگوں کو ہمارا یوں بیٹھنا اچھا نہ لگا۔ میں تین اطراف سے گھر گیا۔ ان میں میرے ہاسٹل کے

دوست تھے۔ انہی دوستوں میں ایک میرا روم میٹ عابد تھا۔ اسے بڑا تجسس تھا کہ میں سلمٰی سے کیا باتیں کرتا ہوں، میرا اس سے کیسا تعلق ہے؟ دوسرا اسرار تھا جو ہاسٹل کا نہیں بلکہ اسی شہر کا رہنے والا تھا، وہ اکثر مجھ سے سلمٰی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھے کریدتا رہتا کہ آخر میرا سلمٰی سے کیا تعلق ہے؟ پھر ایک دن وہ بھی کھل گیا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے جبکہ مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ بھنورا قسم کا لڑکا ہے۔ تیسرا کاظمی تھا اسی شہر کا ایک اور لڑکا جو اتنا امیر نہیں تھا لیکن وہ جو کچھ تھا اس سے بڑھ کے خود کو پیش کرتا تھا۔ روزانہ گاڑی پر آنا اس کا معمول تھا۔ اسے بھی سلمٰی کی آنکھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ یہ سب اس کے قرب کے خواہاں تھے۔ پھر بہت سارے ایسے واقعات ہوئے جس سے کلاس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، وہ دوسروں کی خامیوں کی ٹوہ میں رہنے والے لوگوں کو اک نئے موضوع پر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جیسے میں ان لوگوں کے درمیان حائل ایک رکاوٹ ہوں۔ اس بات کا انہوں نے کئی بار مجھے احساس بھی دلایا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے ان کے درمیان دیوار نہیں بننا چاہئے۔ سلمٰی بذات خود سمجھدار ہے۔ وہ اچھا برا اپنا خود سمجھتی ہے اور پھر میرا اس پر کیا حق ہے جو میں جتاؤں یا اس پر کوئی پابندی لگاؤں؟ سلمٰی اگر قدم آگے نہیں بڑھائے گی تو وہ مایوس ہو جائیں گے لیکن اگر وہ قدم آگے بڑھاتی ہے تو پھر یہ سلمٰی پر منحصر ہے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ جس سے چاہے تعلق رکھے۔ لوگوں نے تو یہی سمجھا تھا کہ شاید میرا اس سے کوئی خاص تعلق ہے اس لیے پابندیاں لگائی ہوئی ہیں۔ سو میں یہی سوچ کر اس سے اپنا تعلق کم کرنے لگا۔۔۔ شاید میں بہت بزدل تھا کیونکہ میں لوگوں کی نفرت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی آنکھ میں میرے لیے حقارت یا طنز ہو اس سے بڑا اور سانحہ میرے لیے کوئی نہیں ہے۔ اب اگر سلمٰی سے ملتا بھی تو عابد میرے ہمراہ ہوتا، میں اسے بٹھا کر خود غائب ہو جاتا۔ وہ کیا باتیں کرتا ہے یا سلمٰی اس سے کیا کہتی ہے، میں نے کبھی یہ پوچھا ہی نہیں تھا اور مجھے اب ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے اس کے بارے میں بہت ساری باتیں کہتا رہتا جنہیں میں سن کر بھی ٹال جایا کرتا۔ یوں میں اس سے دور ہوتا چلا گیا اور جو لوگ اس میں دلچسپی رکھتے تھے اب اس کے نزدیک ہونے لگے لیکن وہ میرا اب احترام کرنے لگی تھی۔ جب بھی موقع ملتا اور میں اکیلا ہوتا تو سیدھی میرے پاس آجاتی اور وہ باتیں بتانے لگتی جو دوسرے لوگ میرے بارے اسے کہتے رہتے تھے۔ پھر نعمانہ نے بھی آنا کم کر دیا، اس کی کوئی گھریلو مجبوریاں تھیں۔ وہ اکیلی ہو گئی لیکن اس کی طرف بڑھنے والے قدم میں دیکھ رہا تھا، وہ اگر اسے صرف اپنے لیے ملتے تو ٹھیک تھا، میں بھی اتنی اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن وہ لوگ میری خامیاں اور میرے بارے میں عجیب و غریب قسم کی باتیں کرنے لگے، جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ یہ بندے کا اپنا ظرف ہوتا ہے، یہ سوچ کر میں نے اہمیت ہی نہ دی۔ اس معاملے میں عابد ذرا بھی پیچھے نہیں تھا۔ وہ اسے میرا دوست سمجھتی اور اس کا یہ سمجھنا بھی ٹھیک ہی تھا کیونکہ میرے ساتھ رہتا تھا۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے اور وہ دن آ گیا جب پہلا سال گزر گیا اور اگلے دن ہم نے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ دوستوں نے اس آخری ملاقات کو یادگار بنانے کے لیے شہر کے ہوٹل میں ایک پارٹی کا اہتمام کر ڈالا۔۔۔ جیسے کسی نے کہا ہے کہ دس بندوں میں سے نو ماننے والوں کی اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا ایک نہ ماننے والے کا دکھ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اور لوگ میرے بارے اپنے ظرف کے مطابق باتیں کرتے رہتے لیکن وہ دن قبل سلمٰی نے ایک ایسی بات مجھ سے منسوب کر دی جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس پارٹی میں سلمٰی بھی آئی۔ میں اکیلا کھڑا سارے انتظامات کو دیکھ رہا تھا

کہ وہ میرے قریب آ گئی۔

"بڑے مصروف ہیں آپ۔۔۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"میں آپ سے مخاطب ہوں۔" لہجے میں خاصا غصہ بھرا ہوا تھا۔

"مجھ سے کچھ کہا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے آپ نے سن لیا۔ کہاں رہتے ہیں آج کل آپ؟"

"یہیں۔۔۔" میں نے انتہائی مختصر جواب دیا تو وہ گلہ کرنے لگی کہ میں اس سے بات کیوں نہیں کرتا؟ اب میں اس سے عشق تو فرما نہیں رہا تھا کہ اس سے گلے شکوے کرتا یا اپنی صفائیاں پیش کرتا۔ بس ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال دیا وہ مطمئن نہ ہوئی۔

"ضرور کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔"

"بھئی مجھے بات چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟۔۔۔ آپ میری بہت اچھی کلاس فیلو ہیں، اچھی دوست ہیں اگر آپ سمجھیں۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس سے زیادہ آپ کے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں، اگر آپ کا کوئی مسئلہ ہو تو میں حاضر ہوں۔" یہ کہہ کر میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ خاموش رہی جیسے سوچ رہی ہو۔ کوئی جواب نہ پا کر میں یونہی ایک طرف بڑھ گیا۔

اگلے دن ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ میری حالت یہی تھی کہ کتابیں خرید کر رکھ دیں اور انہیں پڑھنا کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ بس صبح ہوتے ہی گھر سے نکلنا اور پھر دوست ہوتے اور شہر کے حالات۔۔۔ انہیں دنوں سلمٰی کا خط آ گیا جس میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کن کتابوں سے امتحان کی تیاری کرے؟ اب میں اسے کیا بتاتا، بس جو کتابیں خرید لی تھیں ان کے بارے لکھ دیا۔ تب ہی مجھے بھی احساس ہوا کہ اب پڑھنا چاہیے۔ لہٰذا میں نے پڑھائی شروع کر دی۔ اس سے خط کتابت جاری رہی سوائے پڑھائی کے اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ پھر جس دن میں نے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس رات گھر سے سلمٰی کو فون کیا کہ میں صبح پہنچ رہا ہوں۔ مجھ سے ہاسٹل میں رابطہ کر لیں۔

☆☆☆

جب بندہ انتہائی بوریت محسوس کر رہا ہو تو پھر بے وقوفیاں بھی اچھی لگتی ہیں، ایسی حماقت زندگی کا احساس دیتی ہے جس میں تھوڑی خوشی کے ساتھ وقت گزاری ہو۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا، میں کوئی شرط ہار گیا جس پر مجھے مٹھائی کھلانا پڑی۔ میں اپنے دوست تنویر کے ساتھ مٹھائی لے کر آ رہا تھا کہ کاظمی نے پیچھے سے آ کر کار ہمارے پاس روک دی۔ ہم بیٹھے اور ہاسٹل آ گئے۔ وہ گاڑی لاک کرنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تنویر نے کہا۔

"آج کاظمی سے تھوڑا مذاق کرتے ہیں۔ تم چپ رہنا۔" مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ کیسا مذاق کرے گا۔ مٹھائی کھانے کے دوران کاظمی نے پوچھ لیا کہ یہ کس خوشی میں ہے؟ تنویر فوراً بولا۔

"بس کسی کا کسی کو فون آیا ہے۔۔۔"

"کس کا، کس کو۔۔۔؟" کاظمی نے پوچھا تو تنویر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے کیا گیا ہے۔۔باقی رہی بات کہ کس کا؟ تو میں نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ آج کل آپ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔" اس نے بات اگرچہ اشارتاً کہی تھی اس طرح کہ فوراً وہ سمجھ جائے۔ میں نے دیکھا کاظمی کو یکدم ہی پسینہ آ گیا اس شدت سے کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر چل دیا۔ وہاں بیٹھے سارے دوست اس کی اس حالت پر دم بخود رہ گئے۔ اسی رات کا پچھلا پہر تھا کہ تنویر نے آ کر مجھے جگا دیا۔

"منہ ہاتھ دھو کر ذرا لان میں آؤ، میں نے تم سے بات کرنی ہے۔" میں لان میں پہنچا تو وہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"بتاؤ، کیا بات ہے؟" میری آواز نیند سے بوجھل تھی۔

"یار! آج جو کچھ ہوا میں اس پر بہت پریشان ہوں۔۔کاظمی تمہارا مخالف ہو جائے گا۔"

"پھر کون سی قیامت آ جائے گی؟"

"میرے بھونڈے مذاق سے ہو سکتا ہے کہ سلمٰی بھی تم سے متنفر ہو جائے۔۔۔" وہ واقعی پریشان تھا۔

"ہوتی ہے تو ہو جائے۔۔تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تمہارا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔۔۔" وہ جھنجلا سا گیا۔

"ایک اچھی کلاس فیلو سے زیادہ وہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"یار! مجھ سے تو جھوٹ مت بولو، کیا کچھ نہیں کرتے تم اس کے لیے؟۔۔۔کوئی بندہ اس کے خلاف بات نہیں کر سکتا، دوسری لڑکیوں کی طرح وہ محفلوں کا موضوع نہیں ہے، دور رہ کر اس کے تعلیمی مسائل حل کرتے ہو اور وہ تمہارے بارے میں معلومات لیتی پھر رہی ہے۔۔یہ سب کیا ہے؟"

"ہاں تنویر! ایسی تعلق ہو سکتا ہے جب کوئی کسی اٹوٹ بندھن میں بندھ جائے لیکن میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے اس کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو بس اس کتاب کے حوالے سے انسانی فطرت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ نفرت، منافقت، محبت، اعتماد اور خود غرضی جیسے جذبے کی گہرائیاں معلوم کر رہا ہوں اور پھر کوئی تعلق نہ بھی ہو تو کسی کے لیے کچھ کیا جائے، اس سے بڑھ کر میرے خیال میں اور کوئی خوشی نہیں ہے۔۔تمہارا کیا خیال ہے؟" ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہو گئے۔

اسی دوپہر میں اپنے کمرے میں پڑا نوٹس دیکھ رہا تھا کہ ہوسٹل کے ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ آپ کا فون ہے۔

"ہیلو۔۔۔میں سلمٰی بات کر رہی ہوں۔" اس کی آواز کی شوخی اور لہجہ انتہائی نرم تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ غصے کے آثار کہیں نہیں ہیں۔

"فرمائیں، کیسے یاد کیا ہمیں؟"

"یونہی بس ایک بات کنفرم کرنا تھی۔۔" اس نے کہا تو مجھے یقین ہو گیا کہ لازمی اب یہ مجھ سے کل کے واقعہ کے بارے میں پوچھے گی۔ میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔

"پوچھیں۔۔۔" میں نے کہا تو وہ نصابی باتیں کرنے لگی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ اسے کوئی بات نہیں

پہنچی جب میں نے اپنی طرف سے کوئی بات کرنا مناسب نہ بجھی۔ پھر یونہی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہی۔ صرف اس کی وجہ سے کہ میرا لہجہ خوشگوار اور موڈ اچھا تھا کافی دیر بعد وہ کہنے لگی۔

"اچھا۔۔ جلدی بات ختم کریں، میں نے ہنڈیا چولہے پر رکھی ہوئی ہے اور کچن سے بول رہی ہوں۔۔"

"بات میں نے شروع نہیں کی بلکہ آپ نے فون کیا ہے، آپ فون بند کردیں۔۔ ویسے کیا پکا رہی ہیں آپ؟"

"چنے پکا رہی ہوں۔۔۔" اس نے بتایا۔

"ارے۔۔۔ یہ تو ایک خاص جانور کی خوراک ہے آپ کا کہیں ریس لگانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟" تبھی ایک بھرپور قہقہہ سنائی دیا پھر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کل آپ پیپر کے بعد مجھے ملیں۔"

"آپ تک پہنچنے میں مجھے کم از کم آدھا گھنٹہ لگے گا۔۔۔ انتظار کرلیں گی آپ؟"

"یہی تو مصیبت ہے، آپ لڑکے اور ہم لڑکیاں علیحدہ علیحدہ امتحان دے رہے ہیں۔۔۔ خیر، میں مہرین وغیرہ کے پاس ہاسٹل میں انتظار کرلوں گی۔"

پھر اگلے دن باوجود کوشش کے میں نہ جاسکا۔ لاہور سے میرا انتہائی قریبی دوست آگیا جسے میں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے فون کرکے بتانا چاہا تو وہ وہاں سے جاچکی تھی۔

☆☆☆

اس روز شام کے وقت ہم سب دوست بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ عابد نے اچانک کہا۔

"بھئی، ساجد کے لیے اہم پیغام!۔۔۔ توجہ فرمائیں۔۔۔ ان کا یہ پیغام ہے کہ ساجد مجھ سے بچ کر رہے ورنہ گولی ماردی جائے گی۔" میں دھیرے سے مسکرادیا اور یہی سمجھا کہ میں نہیں گیا اس لئے ناراض ہے مگر تنویر کے پوچھنے پر اس نے کہا۔

"آج میں گرلز ہوسٹل گیا تھا، وہاں مجھے مہرین نے سلمٰی کا پیغام دیا ہے کہ ساجد نے جو باتیں کی ہیں وہ انتہائی گھٹیا اور کمینی حرکت ہے۔ میں اسے گولی ماردوں گی اب اگر اس نے ملنے کی کوشش کی۔۔۔" اس نے تو اپنی بات کہہ دی مگر دوست میرا مذاق اڑانے لگے، اک شور سا مچ گیا۔ ایک تو لہک لہک کے گانے لگا۔

""ٹٹ گئی تڑک کرکے۔۔۔"

میں یہ چاہتا تھا کہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کروں تاوقتیکہ سلمٰی مجھ سے خود بات نہ کرے لیکن تنویر بضد تھا کہ مجھے اس سے بات کرلینی چاہیے، اور اگر میں نے بات نہ کی تو وہ خود کرلے گا، ہوسکتا تھا کہ تنویر کے بات کرلینے پر بات ہاتھ سے نکل جاتی اور میں کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے دوست اسے ڈیپارٹمنٹ میں مذاق بنا کر رکھ دیں۔ جس طرح ایک اور لڑکی نے بدتمیزی کی تھی اور وہ مذاق کا نشانہ بن گئی تھی۔ وہ مہرین ہی

تھی اور آج اس نے بدلہ لے لیا تھا۔ میں اس وقت کال آفس گیا۔ عابد خواہ مخواہ ہی میرے ساتھ نتھی ہو گیا۔ میں نے بھی اسے نہ روکا۔ رابطہ ملتے ہی اس کی آواز آئی۔

"ہیلو۔۔۔"

"میں ساجد بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں فون کیا آپ نے؟۔۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔ آج میری کلاس فیلوز نے صرف آپ کی وجہ سے بہت ذلیل کیا۔" اس کی آواز میں کرب تھا۔

"کیوں؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"انہیں آج ہی تو موقعہ ملا تھا اور پھر آپ کے نہ آنے سے مجھے یقین ہو گیا۔۔"

"سوری۔۔"

"آپ صرف سوری کہہ کر بات ختم کرنا چاہتے ہیں؟۔۔۔۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ اندر سے اتنے گندے ہوں گے۔" وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی اور وہاں میں جتنی مرضی چاہے صفائیاں دیتا رہتا۔ اس نے کسی پر کان نہیں دھرنا تھا۔ پبلک کال آفس میں کچھ لوگ کھڑے تھے اور پھر عابد کی موجودگی نے بھی مجھے انتہائی ڈسٹرب کر دیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے جو سوچا تھا وہ نہیں ہوا تھا۔ سلمیٰ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے تھا اسے مجھ سے اصل بات پوچھنا چاہئے تھی تب میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"سوری۔۔۔ رانگ نمبر۔"

"آئندہ کبھی مجھ سے بات مت کیجئے گا۔" سلمیٰ نے انتہائی غصے سے کہا تو میں نے فون رکھ دیا۔ پیسے دے کر میں باہر نکلا تو عابد نے پوچھا۔

"کس نے اٹھایا تھا فون؟"

"اس کا باپ تھا۔۔۔ سلمیٰ نہیں ملی۔" میں نے اس سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ اب مجھے اس پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

تعلق کی بنیاد ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ کہیں پر بھی دراڑ پڑ جائے تو محبت، پیار اور خلوص کی عمارت کھڑی کرنا بے وقوفی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی اور سلمیٰ کے لیے پر خلوص ہوں اور اگر حالات نے اور ارد گرد کے لوگوں نے اسے مجھ سے متنفر کر دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟۔۔۔ اس کا اعتماد تو اس وقت ہی نہ رہا تھا جب اس نے بات سنی تھی اور مجھ سے کنفرم کیے بغیر یقین کر لیا۔ رات تک مجھے معلوم ہو گیا کہ کاظمی نے سلمیٰ کو فون کر کے ساری بات کہہ دی تھی اور یقینی بات ہے کہ اس نے یہ سارا واقعہ اپنے انداز میں کہا ہو گا اور عابد نے گرلز ہاسٹل میں سب لڑکیوں کے سامنے اپنے انداز میں بات کہہ دی۔ اس کا غصہ ٹھیک تھا، کوئی اور اس کے بارے میں غلط بات کہتا تو اسے اعتماد کھونا ہوتا، اس کے دکھ کی انتہا اس لیے تھی کہ اس معاملے میں اس کے تئیں میرا نام آتا تھا۔ میں بہر حال ساری رات سوچتا رہا، ایک پل آنکھ نہ لگی۔ میرے اور اس کے درمیان تعلق کی بنیاد کیا تھی اور میں اس کے بارے کس انداز میں سوچتا رہا ہوں مگر کیا ہوا کہ وہ ناراض ہو گئی۔۔۔۔ دکھ کی ایک لہر تھی جو بے چین کیے دے رہی تھی۔ بہت

سارے لوگوں کی محبت ہونے کے باوجود ایک شخص اگر ناراض ہو جائے تو ہونے والا دکھ پیمانہ بن جاتا ہے۔ جس قدر دکھ زیادہ ہوگا، اتنا ہی وہ شخص اس کے نزدیک معتبر ہوتا ہے۔

اگلے دن میں نوٹس پھیلائے بظاہر پڑھ رہا تھا لیکن خیالات کہیں اور تھے۔ چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ وارڈن آفس میں آپ کا فون ہے۔ میں گیا تو سلمٰی کا فون تھا۔

''آپ کل کیا کہنا چاہتے تھے؟'' اس کے لہجے میں شرمندگی میں نے واضح طور پر محسوس کی۔

''بس یہی کہ موسم کیسا ہے۔۔۔؟'' میں نے بے تکی سی بات کہی۔

''نہیں پلیز! مجھے بتائیں۔۔۔ لیکن اگر آپ ناراض ہیں۔ نہیں بتانا چاہتے تو میرا کوئی زور نہیں۔''

''کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی۔''

''ساجد! اگر آپ نے کوئی ایسی ویسی بات کی بھی ہے تو میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔'' تو گویا اس کو یقین تھا کہ میں نے غلط بات کہی ہے بجائے اس نے وہ اب بھی کنفرم کرے کہ میں نے یہ بات کی ہے کہ نہیں؟ وہ مجھے معاف کر رہی تھی۔۔۔ اچانک غصے کا دھواں دماغ میں بھر گیا۔ میں نے زور سے ''شٹ اپ'' کہہ کر فون رکھ دیا اور سلگتے دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ شام تک میں نارمل ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب یہ بات ماضی کی ہے کہ میرا سلمٰی سے کوئی تعلق تھا۔

☆☆☆

امتحان ختم ہوئے اور ہم اپنے گھروں کو لوٹ آئے تب سلمٰی کا ایک طویل ترین خط مجھے ملا جس میں اس نے معذرت کی اور نہ ہی تجدید تعلق کیا بلکہ اس خط میں لکھی گئی باتوں سے یہ عیاں ہوتا تھا کہ جیسے درمیانی عہد گم گشتہ باب ہو، جیسے کسی کتاب کی جلد بندی کرتے وقت کسی اور کتاب کا اضافی باب غلطی سے لگ گیا ہو اور جس کا کتاب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے اس خط کا جواب نہیں دیا تو کچھ عرصہ بعد پھر خط آ گیا۔ اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ یوں چھٹیاں بھی گزر گئیں۔ ابھی دنوں بڑے بھائی نے کہا کہ کام مزید پھیل گیا ہے۔ تھوڑا عرصہ ان کے کام کی دیکھ بھال کروں۔ میں روزانہ سائٹ پر جانے لگا۔ تین ماہ مزید گزر گئے۔ اس دوران میں دو تین مرتبہ یونیورسٹی کا چکر لگا آیا تھا۔ ایک دن میں سائٹ سے واپس آیا تو گھر والوں نے کسی لڑکی کے فون آنے کا بتایا۔ پھر رات گئے سلمٰی کا فون آ گیا۔

''آپ اب تک ناراض ہیں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''نہیں تو۔۔۔''

''آپ نے میرے خطوں کا جواب نہیں دیا اور یہاں آتے بھی ہیں تو مجھ سے بات نہیں کرتے۔''

''میں آپ سے کیا بات کروں؟۔۔۔ وہ موسم اب بیت گیا ہے۔۔۔'' میں نے کہا۔

''موسم پھر بھی آ سکتا ہے۔ یہ تبدیلی فطری ہوتی ہے۔'' اس نے جواباً کہا تو میں نے بات کو اور طرف موڑ دیا۔

"کوئی کام تھا آپ کو مجھ سے۔۔۔۔؟"

"نہیں تو۔۔۔بس آپ۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تو میں نے بات کاٹ کر فوراً کہا "خدا حافظ" اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جب نام خارج ہونے کا نوٹس آیا تو میں نے یونیورسٹی کا رخ کیا۔ سو دوبارہ کلاسیں لینے لگا۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ سلمٰی سے بات ہو جائے بلکہ یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ جہاں ہو اس طرف نہ ہی جاؤں۔ چند دن اسی طرح گزر گئے تو قریبی لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اب واقعتاً ان کے درمیان گہری ناراضگی ہے تب کاظمی نے پر نکال لیے۔ اسرار جو عشق سے دستبردار ہو چکا تھا پھر سے اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ لوگ اس کے متعلق یونہی فضول قسم کی باتیں کرنے لگے۔ اس کی بے باکی کو بے حیائی سے تعبیر کرنے لگے اور اس دن میں حیران رہ گیا جب عابد نے بھی اپنے عشق کا اظہار کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد تنویر کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے ساری بات جا کر سلمٰی کو بتادی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ پھر اسی دن راہداری میں جاتے ہوئے سلمٰی نے مجھے روک لیا۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ میرا اس سے تعلق تو رہا لیکن لوگوں کے سامنے نہیں، ٹیلی فون اور خط کے ذریعے سلسلہ رہا۔ میں نے جیسا کہا اس نے ویسا کیا۔ اسرار کو ساری کلاس کے سامنے جھاڑ دیا، کاظمی نے صورت حال بھی اور وہ پیچھے ہٹ گیا اور عابد کو اس نے بھائی بنا لیا۔ اس نے عابد کو ایک نوکر کی حیثیت دے دی، ایک معمولی چپل بھی اگر لانی ہو تو وہ "عابد بھائی" لا کر دے رہا ہے۔ میں اور سلمٰی بیٹھے ہیں تو چائے کا آرڈر "عابد بھائی" دینے جا رہے ہیں۔ تب کلاس فیلوز نے بھی اس کو ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ اسے اس طرح کے فقروں سے نوازتے کہ یار! آج تیری بہن بن ٹھن ہو جانے کی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ کیوں بھئی عابد! تمہاری بہن سے باتیں کر لیں؟۔۔۔ عابد! تمہاری بہن آج فلاں کے ساتھ لان میں ہنس رہی تھی۔۔۔ یار! کسی عالم سے پوچھا جائے کہ منہ بولی بہن سے نکاح جائز ہے؟ کم ظرف لوگ محفلوں میں جس انداز سے باتیں کرتے تو یوں لگتا جیسے ضمیر نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ سلمٰی کا مزاج بھی اب تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکوں میں زیادہ بیٹھنے لگی تھی، پھر لڑکے بھی خواہ مخواہ کی جھوٹی باتیں منسوب کر کے مجھے سناتے۔ مجھے ذہنی اذیت تو ہوتی لیکن کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کم از کم ایک دفعہ اسے خبردار کر دوں تاکہ وہ سوچ کر دیکھ بھال کر قدم رکھے۔ میں نے نعمانہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی دن مجھے موقع مل گیا اور وہ اکیلی دفتر میں کسی کام سے گئی تھی۔

"نعمانہ! ایک منٹ ذرا بات سنیے گا۔"

وہ واضح طور پر میری بات سنی ان سنی اور نظر انداز کر کے چل دی۔ اس قدر نفرت۔۔۔۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ پھر دل نے کہا کہ تم اپنی طرف سے فریضہ نبھا دو، آگے ان کی قسمت۔۔۔ میں سلمٰی کے پاس گیا۔ اس نے بھی انتہائی نفرت سے کہا کہ میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ میں دل گرفتہ نہیں ہوا بلکہ پرسکون ہو گیا کہ میرے ضمیر پر بوجھ نہیں رہا۔

☆☆☆

ہمارے لیے وہ رات یونیورسٹی میں آخری رات تھی۔۔میں تنویر کے ساتھ بیٹھا پرانی باتیں دہرا رہا تھا کہ اچانک اس نے کہا۔

"یار! سلمٰی سے تمہارا عشق خوب چلتا اگر عابد درمیان میں نہ آ جاتا۔"

"نہیں کس بے وقوف نے کہا ہے کہ میں اس سے عشق کرتا تھا؟"

"وہ تمہارا اس سے تعلق، قدم قدم پر تحفظ، کسی کا اس کے بارے میں غلط سوچنے والے پر غصہ آ جانا، کلاس الیکشن میں اپنی نشست اس کو دے دینا۔۔خط، ٹیلی فون، آخر یہ کیا تھا؟"

"نہیں، یہ بات نہیں،، جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے اور میں نے جو حالات دیکھے ہیں ان کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ اس سے شادی نہیں ہو سکتی تھی۔۔اس نے کہا ہوگا کہ والدین کو بھیجو تو۔۔۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔۔۔میں اس سے شادی کر سکتا تھا، والدین کی طرف سے اجازت ہے کہ میں جس کو پسند کر لوں اس سے شادی ہو جائے گی۔۔ذات برادری کا، دولت کا یا کوئی اور مسئلہ نہیں تھا۔"

"تو پھر یہ اسی کے لیے کیوں؟۔۔۔اور بھی کلاس فیلوز تھیں اور پھر اتنا کچھ وہ بھی در دورہ کر، آخر کس لیے؟"

"ضروری نہیں کہ ہر لڑکی عشق کے قابل ہو اور میرے جذبات اتنے سستے نہیں ہیں۔۔۔۔میرے بھائی! میں اس سے عشق نہیں کرتا تھا بلکہ دل کی گہرائیوں سے عزت کرتا تھا۔میں نے اسے اپنا مان لیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ تعلق نہ رہا تو پھر کیا ہوا؟۔۔۔بتاؤ، آج تک میں نے یہ کہا کہ مجھے سلمٰی سے عشق ہے یا اس سے محبت کرتا ہوں؟۔۔۔یہ عمل میرے لیے تجربہ ثابت ہوا ہے۔یوں سمجھ لو کہ وہ شیلف میں رکھی ہوئی کتاب کی مانند تھی۔میں نے اسے پڑھا اور ہر اچھا پڑھنے والا کتاب کی نہ صرف عزت کرتا ہے بلکہ اس کو سنبھال کر پڑھتا ہے۔اس پر اپنا نام نہیں لکھتا، لکیریں نہیں ڈالتا، اس کو خراب نہیں کرتا اور نہ ہی اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔۔۔باقی رہی بات کہ کتاب کیسی ہے؟ تو یہ ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے۔چاہے جتنی بور کتاب ہو، اس میں چند اچھی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں اور تنویر! اس کتاب کے توسط سے میں نے منافقت اور خلوص کی پہچان کرنا سیکھ لی ہے۔۔۔وہ کتاب میری ملکیت نہیں تھی اور تم گواہ ہو کہ میں نے آج تک ملکیت کا حق نہیں جتایا، اس پر کوئی نہیں لکیر نہیں کھینچی بلکہ گرد و غبار سے بچایا ہے اور اب احتیاط سے اسے دوبارہ شیلف میں رکھ دیا ہے۔"

❀❀❀

ماں جیسی

فون زاری بیگم ہی نے اٹھایا تھا، لیکن اس کی "ہیلو" مجھے عجیب سی لگی۔ میں جو کھنکتے ہوئے منفرد سے لوچ دار لہجے میں توقع کر رہا تھا، اس کی بجائے مجھے کھردرا اور خشک لہجہ سننے کا ملا تھا۔

"خیریت تو ہے زاری بیگم، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے چند تمہیدی فقروں کے تبادلے کے بعد اس کی آواز کے حوالے سے پوچھا تو وہ غصے میں لپٹے ہوئے بظاہر نرم لہجے میں بولی۔

"کیا بتاؤں میں آپ کو، ان دنوں میں ایک ایسی پریشانی میں گھر گئی ہوں، جو کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔"

"پریشانی، بتا نہیں سکتی، معاملہ کیا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا

"پھر کسی وقت سہی، اس وقت تو آپ یہ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔" اس نے واضح طور پر میری بات نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے لفظوں میں کام کی بات کرنے کو کہا۔ تو میں نے بھی اس کے معاملے کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے سیدھے اپنے مطلب پر اتر آیا۔

"آپ نے یہاں آفس آنا تھا۔ اور پھر آپ نے کچھ ماڈل گرلز سے بھی ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔ میری فوٹو گرافر روزانہ مجھ سے پوچھتی ہے اور آپ کا کوئی پتہ نہیں ہے۔" میں نے صاف انداز میں اس سے پوچھا۔

"اوہ۔!" اس نے یوں کہا جیسے وہ بھول گئی ہو، پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی "مجھے سب یاد ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں ذہنی طور پر اس قدر پریشان ہوں کہ۔۔۔ بس کیا بتاؤں۔ پلیز یہ سب کسی اور وقت پر رکھ لیں۔ میں شاید ان دنوں کوئی بھی وعدہ نبھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" اس نے اسی کھردرے اور خشک لہجے میں کہا تو میں نے مزید بات کرنا مناسب ہی نہ سمجھا، سو چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

زاری بیگم اداکارہ تھی، کسی زمانے میں جب ٹیلی وژن کی رنگین نشریات شروع ہوئیں تھیں، انہی دنوں زاری بیگم نے بحیثیت اداکارہ اس دنیا میں قدم رکھا تھا۔ وہ بھرپور جوان، حسین اور معصوم چہرے والی اداکارہ تھی۔ جس نے ایک ہی ڈرامہ سیریل کے بعد شہرت پا لی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں ایک ہی ٹی وی چینل تھا اور عوام وہی چینل دیکھنے پر مجبور تھے۔ اداکار بھی اتنے ہی سے تھے کہ ان کے چہروں کو بخوبی یاد رکھا جا سکتا تھا۔ ایسے میں کوئی نیا اور متوجہ کر لینے والا چہرہ بہت جلد مقبول ہو جاتا تھا۔ ابھی اس نے عوام کے ذہنوں میں جگہ بنائی ہی تھی کہ اچانک وہ منظر سے غائب ہو گئی۔ اس کے بارے میں مختلف افواہیں گردش کرنے لگیں۔ کسی نے سرخی جمادی کہ وہ شادی کر کے وطن سے باہر چلی گئی ہے، کوئی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ وہ کسی جاگیردار کو پسند آ گئی ہے، اس لیے وہ منظر سے غائب ہو کر اسے پیاری ہو چکی ہے۔ ایک میگزین نے یہ تو یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہیروئن سمگل کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے اور اب دوبئی کی کسی جیل میں ہے۔ ہر بات کے ساتھ ایک لمبی کہانی بھی

تھی۔افواہ چونکہ پہاڑ کی چوٹی سے گرنے والی برف ہوتی ہے۔جوں جوں نیچے گرتی ہے وہ تودہ بن جاتی ہے اور پھر تو وہ پگھل کر زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔بالکل ایسی طرح وقت کے ساتھ یہ افوائیں بھی دم توڑ گئیں۔زاری بیگم قصہ پارینہ بن گئی۔میں جب شوبز سے متعارف ہوا تو میں اس پس منظر سے واقف نہیں تھا۔تاہم ایک اشتہاری کمپنی میں کام کرنے والے میری دوست زاہد بخاری نے یونہی باتوں کے دوران مجھ سے کہا۔

”او یار۔ایاد آیا تمہارے پاس ایک اداکارہ آئے گی زاری بیگم،پہلے وہ فون کرے گی۔اس کا بہت خیال رکھنا۔وہ میرے کرم فرماؤں میں سے ہے۔بہت جگہ میرے کام آئی ہے۔نہ صرف اپنے میگزین کے لیئے بلکہ اپنے اخبار کے شوبز رپورٹر سے بھی ملوا دینا۔“

”حدود اربعہ کیا ہے اس کا؟“میں نے ایک خاص اصلاح میں رازی بیگم کے بارے میں مزید معلومات چاہیں۔تب اس نے پس منظر بتاتے ہوئے کہا۔

”باقی تم اس سے ملو گے نا تو وہ تمہیں اپنے بارے میں وہ سب بتا دے گی جو تم پوچھنا چاہو۔تب سارا ہی حدود اربعہ معلوم ہو جائے گا۔اس کی سب سے بڑی صلاحیت یہ ہے کہ تیرے جیسے خشک بندے کو بھی اپنا بنا لے گی،بہت ملنسار اور کام آنے والی خاتون ہے۔“

”چلو آئے گی تو دیکھا جائے گا۔مگر مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے تم اس کے وکیل ہو۔“میں نے ہنستے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔

”یار تم یہی سمجھ لو۔“اس نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور پھر ہم اپنی باتوں میں مگن ہو گئے۔

زاہد بخاری سے بات ہوئے تقریباً دو ہفتے ہوئے تھے۔اپنی مصروفیت میں زاری بیگم کا نام بھی ذہن سے اتر گیا تھا۔ایسے ہی ایک چلچلاتے ہوئے دن انٹرکام پر استقبالیے سے معلوم ہوا کہ موصوفہ وہاں آئی کھڑی ہے۔میں نے اسے اندر اپنے کمرے میں بلوا لیا۔پہلی نگاہ میں وہ قطعاً ادھیڑ عمر دکھائی نہیں دیتی تھی۔جوانی کا خمار اب بھی اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔اچھی صحت کی بدولت اس میں جوانی کے دور میں دکھائی دینے والی لڑکی جھلک رہی تھی۔اس دور میں خواتین جو سنگھار کرتی تھیں،اپنا ہیر سٹائل بناتی تھیں یا ملبوسات کی ایک خاص تراش ان دنوں میں مقبول تھی۔وہ سارا عکس اس میں دکھائی دے رہا تھا۔یوں جیسے سن ساٹھ کی دہائی میں لکھے گئے کسی افسانے کی ہیروین حقیقی روپ میں سامنے آ گئی ہو۔یہ حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ اس کی عمر میں اضافہ ہوا تھا لیکن لگتا یوں تھا کہ جیسے وقت اس پر ٹھہر گیا ہو۔وہ وقت جو اس کا اپنا پسندیدہ تھا،اور جس میں رہنا وہ پسند کرتی تھی۔وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔تھوڑی دیر باتوں کے بعد جب ہم کافی پی چکے تو میں نے پوچھا۔

”جی فرمایئے۔میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”دیکھئے۔اس وقت میں کسی بھی کام سے نہیں آئی۔کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے ملوں۔آج ادھر سے گذر رہی تھی،سوچا ملتی جاؤں۔“اس نے کھنکتی ہوئی آواز اور لوچ دار لہجے میں کہا۔

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔“میں نے بھی تکلفاً کہا۔

”آج میں آپ کو خصوصی طور پر دعوت دینے آئی ہوں کہ جب بھی آپ کو فرصت ہو،میرے غریب خانے پر تشریف لائیں،وہیں پر کام کی باتیں بھی ہو جائیں گے۔“اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے اس طرح بہت دن لگ جائیں اور مجھے فرصت نہ ہو، آپ پلیز بتائیں۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ زاہد بخاری میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں ہر ممکن حد تک۔۔۔" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ ایک پرسکون ماحول میں کام کی باتیں ہوں۔ اور پھر جس طرح بخاری صاحب آپ کے دوست ہیں۔ ہم بھی آپ کے دوست بن جائیں کیا خیال ہے؟" اس نے ایک دوسرے انداز میں اپنی ہی بات منوانا چاہی۔ شاید وہ مجھے احساس دلا رہی تھی کہ وہ اپنی بات منوانا جانتی ہے۔

"خیال تو بہت اچھا ہے۔ لیکن یہاں مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے۔ میں فقط شوبز ہی نہیں دیکھتا بلکہ پورا میگزین۔۔۔"

"میں آپ کو فون کر کے یاد دلاتی رہوں گی۔ جب بھی آپ کو موقع ملے" اس بار زاری بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے بھی وہیں بات ختم کر دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ "یہ میرا فون نمبر ہے۔ آپ اس پر کال کر سکتے ہیں۔" اس نے ایک کاغذ پر اپنا نمبر لکھتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

اگلے ہفتے میں اس نے تین بار مجھے یاد دہانی کروائی تو پھر ایک دن میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت شام ہونے کو تھی جب میں اس کے گھر کے لیے اپنے آفس سے نکلا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد میں اس علاقے میں پہنچ گیا جو کسی زمانے میں لاہور کا پوش علاقہ تصور کیا جاتا رہا تھا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وہاں بہت بڑے بڑے نام والی شخصیات یا پھر امیر آدمی وہاں پر رہائش پذیر تھے۔ میں جس گھر کے سامنے پہنچا وہ پرانے طرز کے بنگلے جیسی عمارت تھی۔ کچھ دیر بعد میں ایک سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں تھا، جس کی سجاوٹ دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں سن اسی کی دہائی میں بننے والی اردو فلموں کے کسی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا زاری بیگم کے بارے میں یہ تاثر بن گیا کہ وہ اپنے عروج کے زمانے میں ہی کہیں کھو گئی ہے۔ اس نے جدید فیشن کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے گھر کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی گپ شپ کے بعد زاری بیگم کے ساتھ تکلف کی فضا ختم ہو گئی اور اس کی جگہ خوشگوار ماحول نے لے لی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ چند ملاقاتوں کے بعد کام کی باتیں بھی ہونے لگیں بلکہ میں اس کے بارے میں بہت واضح ہو گیا۔

زاری بیگم نے سن اسی کی دہائی میں فقط شوق کے تحت اداکاری شروع کی تھی۔ اس کی والدہ، قیام پاکستان سے پہلے امرتسر کی مشہور طوائفوں میں سے ایک تھی۔ وہ اگست 47ء سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان کے شہر لاہور میں آ بسی تھی۔ امرتسر میں اس کا اچھا خاصا رکھ رکھاؤ تھا۔ جو اس نے یہاں بھی آ کر برقرار رکھا۔ وہ اپنے ساتھ ساری جمع پونجی بھی لے آئی تھی اور وہاں کا محل نما مکان بیچ کر اس کے دام بھی کھرے کر لیے تھے۔ یہاں آ کر اس نے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ دیا اور اپنے ہی پرانے واقف کاروباری آدمی سے شادی کر لی۔ اس کی اولاد میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، جن میں زاری بیگم سب سے آخری اولاد تھی جسے بہت لاڈ پیار ملا۔ زاری بیگم نے اپنے گھر میں کاروباری گھرانے جیسا انداز بھی دیکھا تھا۔ گھنگھرو طبلے کی آواز کو تو جیسے وہ دفن کر چکے تھے۔ لیکن جب تک وہ جوان ہوئی، اس وقت تک فلموں اور ٹی وی ڈراموں کا ایک کریز بن چکا تھا۔ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ساتھ میں اداکاری کا شوق بھی پروان چڑھ چکا تھا۔ اداکاری کی خواہش اس لیے بھی شدت اختیار کر گئی تھی کہ ان کے

لیے ٹی وی کوئی بہت دور کی شے نہیں تھی۔ بلکہ ذرا سی کوشش کے بعد اسے ایک سیریل مل گئی۔ جس میں اس نے جتنا ضد کر کے کام کیا اتنا ہی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ شہرت جہاں بہت تیز نشہ ہے وہاں بعض اوقات وبال جاں بھی بن جاتی ہے۔ زاری بیگم کے منظر عام پر آتے ہی امرتسر والی طوائف کی شہرت بھی سامنے آنا شروع ہو گئی جو اتنے برس گزر جانے کے بعد حالات کی گرد میں چھپ گئی تھی اور کاروباری حلقے میں ان کی پہچان ایک نئے انداز میں ہو گئی تو کسی نے ماضی ٹٹولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ جب اس نے اداکاری شروع کی تو دبے دبے لفظوں میں حالات کی گرد کے نیچے پڑی پہچان واضح ہونے لگی۔ اور پھر شہرت نے کسی تیز ہوا کی مانند ساری گرد اڑا دی۔ تب زاری بیگم کے بہن بھائیوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اسے دبا کر چار دیواری تک محدود کر دیا۔ شوبز تو کیا، اس سے متعلق کسی فرد کی رسائی زاری بیگم تک نہ ہوئی۔ یوں افواہوں کا بازار گرم ہوا تھا جو دھیرے دھیرے ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ زاری بیگم کی شادی لاہور ہی کے ایک کاروباری گھرانے میں ہو گئی۔ اس کا شوہر افضل بٹ اسے بیاہ کر اسی گھر میں لے آیا۔ جہاں وہ ان دنوں رہ رہی تھی۔

افضل بٹ، ان لوگوں میں سے تھا جو فقط دولت بنانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دولت کس طرح اور کیسے آتی ہے۔ اس سے انہیں غرض نہیں ہوتی۔ اس نے ایک شاندار ہوٹل اور ایک شاپنگ پلازہ بنایا۔ جس سے وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنے کاروبار کو بڑھانے کی تگ و دو میں لگ گیا۔ افضل بٹ طبعاً عیاش قسم کا بندہ تھا۔ اس کی سرگرمیاں زیادہ تر انہی لوگوں کے ساتھ تھیں، جو شوبز سے تعلق رکھتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ دھیرے دھیرے افضل بٹ کو اس دنیا سے بھی دولت کمانے کے ذرائع دکھائی دیئے تو وہ پروڈیوسر بن گیا۔ اس شعبے میں آنے کے لیے بلاشبہ زاری بیگم نے بھی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی تھی۔ یوں اس کام میں دونوں کی خواہش شامل ہو گئی۔ افضل بٹ کا شوبز میں اچھا خاصہ حلقہ بن گیا تھا۔ جبکہ اپنی دلچسپی کے تحت زاری بیگم بھی اس کاروبار میں شریک ہو گئی۔ جو دن بدن بڑھتا چلا گیا۔

زاری بیگم کے من میں اداکاری کی خواہش راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح موجود رہی تھی۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ اداکاری کرے۔ لیکن ایک تو اپنی سطح کا لحاظ کرتے ہوئے اور دوسرا بہن بھائیوں کے خوف سے جس کا ماضی سے سامنا تھا۔ وہ اداکاری نہ کر سکی تھی۔ تاہم اپنے بزنس کو سپورٹ دینے والے لوگوں سے ملنا ملانا اور دوسرے اقدامات وہی کرتی رہی، جس میں صحافیوں سے اچھے تعلقات بھی شامل تھے تاکہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے بہت اچھا تاثر عوام تک پہنچ سکے۔ جو بلاشبہ مضبوط تعلق کی بناء پر ہو سکتا تھا۔ پھر ایک دن آیا کہ راکھ کی چنگاری کو ہوا مل گئی۔ اس نے اپنی ہی بڑے بجٹ کی ایک ٹی وی سیریل میں ایسا بھرپور کردار نبھایا کہ وہ فوراً ہی لوگوں کی نگاہ میں پہچان بنا گئی۔ نجانے کب سے تشنہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ زاری بیگم کو جو توقع سے زیادہ شہرت ملی تو وہ اپنے اس تاثر کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے اس میں اپنی شہرت کیش کرانے کی خواہش بھی تھی۔ سوانہی دنوں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ زاہد بخاری کے کہنے پر میں نے اس سے کافی کام لیے۔ زاری بیگم نے بھی میری مدد کی۔ میری اس سے فقط یہی دلچسپی تھی کہ مجھے ہر ہفتے سرورق چھاپنے کے لیے نئی ماڈل کی ضرورت ہوتی تھی۔ سو یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے رابطے میں ایسی کئی ماڈل گرلز تھیں جو اداکاری کی خواہش میں ماڈلنگ کرتی تھیں۔ میری فوٹو گرافر چونکہ این سی اے سے تعلیم یافتہ تھی، اس لیے وہ بھی اپنے آپ میں جہان شے تھی۔ اس کا بھی کام آسان ہو گیا۔ یوں ہمارے درمیان تعلق بڑھتا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ زاری بیگم کی سمجھ بوجھ تھی کہ اس نے ہمیشہ

میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔ یعنی معمول کے اس برتاؤ سے ہٹ کر جو عام شوبز رپورٹر کے ساتھ تھا۔ اور پھر میں شوبز رپورٹنگ کا بندہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کوئی غرض یا مطلب نہیں رکھا تھا۔ ہاں۔! ایک بات جو مجھے اچھی لگتی تھی وہ اس کا کھنکتا ہوا لوچ دار لہجہ تھا بعض اوقات میں وہ سننے کے لیے طویل بات کر جایا کرتا تھا۔ اس سے جو بات بھی ہوتی، اس میں بہر حال خوشگواریت کا تاثر ضرور ہوتا تھا۔ اس دن جب میں نے اس کا کھردرا لہجہ سنا تو مجھے قطعاً اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اس بارے سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

''آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔! میں ناراض نہیں ہوا۔ بلکہ مجھے یہ اچھا لگا کہ آپ نے کسی بہانے کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ مجھے صاف بتا دیا۔ ورنہ میں آپ سے امید رکھتے ہوئے کسی دوسرے ذریعہ سے رابطہ نہ کر پاتا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے مروتاً کہا۔ حالانکہ ایسا کہنے کو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ میں فوری طور پر اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔

''یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ایسا سوچا، لیکن اب میں نے دھیان دیا ہے تو مجھے لگا کہ میں آپ کو اپنا مسئلہ بتا دوں۔'' اس نے تذبذب سے کہا۔

''اب میں اس پر کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں کسی بھی ردعمل کا اظہار نہ کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

''آپ پلیز ایسا کیجئے کہ آج ہی، بلکہ ابھی وقت نکالیں اور میرے ہاں آ جائیں۔ میں یہاں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔'' اس نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

''میں دفتر سے گھر جاتے ہوئے آپ کے پاس آ جاؤں گا۔'' میں نے حتمی سے لہجے میں کہا تو وہ ذرا سے خوشگوار لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہی ہوں۔'' پھر چند باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔

اس وقت شام کے سائے ڈھل جانے کے باعث شہر بھر میں برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ جب میں اس کے ہاں پہنچا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی۔ پھر سہولت سے بیٹھ جانے کے بعد بولی۔

''دراصل میں اس مسئلے میں تشہیر نہیں چاہتی، کیونکہ اس میں سراسر میرا اپنا ہی نقصان ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر کسی صحافی کے ہاتھ لگ گیا تو میں خواہ مخواہ حتمی قسم کی خبروں میں آ جاؤں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے سو جن، سو دشمن ہیں۔''

''آپ نے تو کبھی کسی سے نہیں بگاڑی؟ پھر آپ کے سو دشمن کیسے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ایسا ہو گیا ہے نا۔'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ ''خیر۔! میں آپ کو بتاتی ہوں، لیکن، پلیز یہ خبر کے لیے نہیں ہے بلکہ میں آپ سے مدد کی خواہاں ہوں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''چلیں، آپ بتائیں تو سہی۔'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ جو ابھی میری ٹی وی سیریل چلی ہے، اس میں میرا کردار بہت بھرپور قسم کا تھا۔ رائٹر سے میں نے خود لکھوایا تھا۔ یہ آپ کو بھی معلوم

ہے۔اس سے مجھے ایک خاص قسم کا بوم ملا ہے۔ میرا شوق بھی پورا ہو گیا اور آئندہ مستقل اداکاری کا موقع بھی مجھے مل گیا ہے۔ بہت عرصے سے میرے دل میں ایسی خواہش تھی۔ میری اس خواہش کے بارے میں آپ کو بھی پتہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پہلو بدل کر بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔"اب ہوا یوں کہ جہاں بٹ صاحب نے اپنی نئی سیریل کے لیے ایک کردار مجھے آفر کیا ہے بلکہ دو ڈائریکٹرز تو مجھے سائن بھی کر چکے ہیں۔اب وہ کیسا کردار لکھوائیں گے یہ مجھے نہیں معلوم، میرا ان سے بہرحال معاہدہ ہو گیا ہے۔"

"ایک منٹ۔" میں نے اس کی رواں گفتگو کو روکا اور پوچھا۔"کوئی سے کردار سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"مطلب، وہ میری شخصیت کو دیکھ کر ہی کردار لکھوائیں گے،خیر یہ ایک ضمنی سی بات تھی، میں اصل بات بتاتی ہوں۔" اس نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔یعنی یہ ابھی تمہیدی تھی۔"میں ان کی سیریل میں کام کروں گی یہ طے ہے،اور دوسرا ایک فلم کے لیے بھی میرے ساتھ بات چل رہی ہے۔لیکن۔انجانے کون دشمن ہے، چند دنوں سے وہ مسلسل فون پر مجھے دھمکیاں دے رہا ہے کہ میں اداکاری بالکل نہ کروں، اگر کی، تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔" اس نے یوں کہا جیسے ایک بہت بڑی بات کا بوجھ اس کے سر پر سے ہٹ گیا ہو۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔

"کون ہے وہ۔مطلب اس نے اپنا کوئی نام یا کوئی پہچان بتائی۔" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں نا، ایسا ہی تو نہیں ہے۔ ورنہ میں اب تک اسے تلاش کر کے۔اس تک پہنچ نہ گئی ہوتی۔آپ کو پتہ ہے کہ میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔اب یہ بھی معاف کر دینے والی بات نہیں ہے کہ کوئی ایرا غیرا اٹھ کر مجھے دھمکیاں دینا شروع کر دے۔" اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔تو میں چند لمحے سوچتا رہا پھر پوچھا۔

"زاری بیگم۔! آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کوئی ایرا غیرا ہی ہے؟" میں نے کہا تو وہ چونک گئی۔تب میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اس نے کوئی ایسی وجہ بتائی کہ وہ کیوں آپ کو اداکاری نہ کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔کوئی شرط یا کوئی بلیک میلنگ یا پھر کوئی مطالبہ؟"

"میں نے پوچھا تھا اس سے کہ وہ کیوں ایسا کہہ رہا ہے۔جس پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس اس کا یہی مطالبہ ہے کہ میں اداکاری نہ کروں۔ورنہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔اس کے علاوہ وہ کوئی بات ہی نہیں کرتا۔اب یہ بات کہ مجھے اس کے ایرے غیرے ہونے کا احساس کیوں ہوا۔تو ظاہر ہے میری شہرت سے کسی نے حسد محسوس کیا ہو گا اور اس نے کوئی غنڈہ بدمعاش میرے پیچھے لگا دیا ہے کہ میں ڈر جاؤں اور اداکاری سے باز آ جاؤں۔"

"آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوئی بھی ہے، ادھر شوبزنس کے حلقے میں سے ہے۔بہت قریب ہی ہے لیکن، اسے معلوم ہے کہ میں نئے معاہدے سائن کر چکی ہوں۔اور مزید بات چیت کر رہی ہوں۔" وہ ایک تنتنے سے بولی۔

"آپ کو علم ہے کہ پچھلے دنوں بازار حسن میں بھی ایک نوجوان اداکارہ کا قتل ہوا ہے۔پھر بھی آپ یہ خیال کر رہی ہے یہ کوئی شخص حاسد ہے جو آپ کو اداکاری سے روکنے کے لیے دھمکیوں پر اتر آیا ہے۔" میں نے اسے حالات کا ایک نیا پہلو دکھایا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی۔پھر بولی۔

نہیں، یہ وہ بازارِ حسن والی بات نہیں ہے۔ وہ کوئی اور معاملات تھے۔ میرے معاملات میں تو یقیناً کوئی میری شہرت سے حسد کر علاوہ خائف بھی ہو گیا ہے۔ ورنہ پہلے بھی کسی نے ایسی دھمکی نہیں دی، اور پھر یہ بات اس لیے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ صرف اداکاری سے روکنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔" اس نے صاف انداز میں کہا۔

"آپ نے خود سے کوئی وجہ جاننے کی کوشش کی۔" میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے وجہ پوچھی، اس کا بس یہی ایک مطالبہ ہے کہ میں اداکاری نہ کروں۔ ضد ہو گئی ہو جیسے۔" زاری بیگم نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ تو میں نے ساری بات سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"تو بتائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"یہی کہ اس بندے کو تلاش کیا جائے، اس تلاش میں آپ میری مدد کریں۔" اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"دیکھیں۔! میں کوئی فورسز کا بندہ تو ہوں نہیں۔ ایک معمولی صحافی ہوں۔ اپنے طور پر کوشش ہی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرادی اور پھر ذرا سے خوشگوار انداز میں بولی۔

"ارے نہیں۔ میں اس طرح سے تھوڑا کہہ رہی ہوں۔ بلکہ میرا مطلب ہے کہ کہیں کوئی اشارہ آپ کو مل جائے۔ وہ جس طرح آپ کو اپنی خبروں کے لیے ٹپ مل جاتی ہے۔ ویسے میں نے ابھی بٹ صاحب سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ پہلے ہی بہت مشکل ہے۔ خیر آپ سمجھتے ہیں۔ یہ بات دہرانے کا فائدہ ہی نہیں۔" اس نے کہتے کہتے بات ختم کر دی۔ پھر تھوڑی دیر تک اسی موضوع پر باتیں چلتی رہیں۔ اس کے بعد میں اس کے پاس سے اٹھ آیا۔

زاری بیگم کا یہ مسئلہ کوئی نیا یا حیران کن نہیں تھا۔ شوبز کی دنیا میں ایسے معاملات چلتے ہی رہتے ہیں جیسے فلمی ہیروئنوں کے درمیان خبروں کھلانے کی چپقلش اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے، چٹ پٹے، مصالحے دار بیانات سے قاری نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ ان کی اس جنگ میں بہت سارے پہلو بھی عیاں ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ زاری بیگم نے جو باتیں کہیں ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہوں مثلاً یہ کہ اس کے اپنے شوہر سے یہ بات چھپائی ہوئی ہے۔ ایسا ممکن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی اپنے گھر پر کڑی نگاہ تھی۔ میں نے جو سمجھا وہ یہی تھا کہ یہ ان کے بزنس کا معاملہ ہے۔ ان کے حریف کوئی نہ کوئی حربہ تو آزماتے ہی ہوں گے اور ان لوگوں سے بھی بعید نہیں تھا کہ انہوں نے کسی کے خلاف سازش کی ہو۔ اور ردعمل کے طور پر اسے دھمکیاں مل رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ لوگ ہی کسی کے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہوں۔ اور پھر زاری بیگم کا یہ ڈرامائی انداز کی میں خبروں میں نہیں آنا چاہتی کہ کہیں شہرت کو نقصان نہ ہو۔ یہ الٹی گنگا بہنے والی بات تھی۔ حالانکہ شوبز کے لوگ تو خبروں میں رہنے کے لیے اسکینڈل تک خود ڈیزائن کرتے ہیں۔ یوں مجموعی طور پر زاری بیگم کی پوری بات میرے حلق سے نہیں اتری میں نے اسے معمول کا واقعہ سمجھ کر ذہن میں تو رکھا لیکن اس کے لیے کوئی خاص تگ و دو نہیں کی۔

چند دن گذرنے کے بعد ایک صبح دفتر آتے ہی معمول کے مطابق اخبار پڑھے تو ان سب ہی میں زاری بیگم کی تصویر دیکھی۔ وہ کسی نئے ڈرامے کے افتتاح پر لیا گیا گروپ فوٹو تھا۔ اس تصویر میں زاری بیگم بہت خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں

سن اسی کی دہائی کے فیشن کی نمائندگی کرتے ہوئے بڑی منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس دن اتفاقاً ہمارے ہی اخبار کا شوبز رپورٹر ساجد گوندل بھی میٹنگ کے بعد میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس تصویر پر تبصرہ کرنے کے علاوہ افتتاح کی روداد سننے کی غرض سے ذکر چھیڑ دیا۔ تب وہ بولا۔

"ہاں، رات اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ یہ تصویر تو بڑے پرامن ماحول میں بنی ہے۔ سمجھیں یہ سیریل تو بنانے سے پہلے ہی بک گیا ہے۔ بڑے بڑے لوگ تھے وہاں پر۔"

"یہ زاری بیگم کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس کی مانگ زیادہ ہو گئی ہے یا پی آر او؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"بہت تیز خاتون ہے۔ مجھے شوبز کا ابھی اتنا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ لیکن جو بھی ہے۔ اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس جیسی تیز اور چرب زبان خاتون نہیں دیکھی۔ لمحوں میں بندے کو اپنی راہ پر لے آتی ہے۔" وہ تو جیسے شروع ہو گیا۔

"میں اس کی خصوصیت نہیں پوچھ رہا میرے یار، میں اس کے پہلے سیریل کے بعد والی پوزیشن کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے اس کی گفتگو کو ٹریک بدلنے کے لیے کہا تو اس نے سوچتے ہوئے بڑے رازدرانہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ ایوارڈ تو ملا ہے اس کو۔ لیکن۔ اس کے ساتھ قتل کی دھمکیاں بھی تو مل رہی ہیں۔"

"ایسا کیا۔" میں نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ جو بات وہ چھپانا چاہتی ہے وہ کھلے راز کی مانند ہر کسی کو معلوم ہے۔ بلاشبہ یہ بات مخصوص حلقوں میں بھی گردش کر رہی ہوگی۔ میری حیرت کا ساجد گوندل پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس لیے تفصیلاً بولا۔

"اس میں دو باتیں ہو سکتی ہیں، زاری بیگم اپنے آپ کو اہمیت دینا چاہتی ہے۔ لوگوں پر وہ یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ بہت بڑی فنکارہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دھمکیوں والی بات حقیقت ہے تو زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ دھمکی دینے والا سامنے آ جائے گا۔ بلکہ پکڑا جائے گا۔ یہ زاری بیگم کے ہاتھ خاصے لمبے ہیں۔"

"تمہاری پہلی بات سے میں اتفاق اس لیے نہیں کروں گا کہ اگر اس نے یہ بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ایسا کہا ہوتا تو اخبار کس مرض کی دوا ہیں۔ یوں سینہ بہ سینہ بات پھیلانے سے بہتر نہیں ہے کہ بات ایک دن میں ہی سب کو معلوم ہو جائے۔" میں نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ نہیں سمجھتے کہ سینہ بہ سینہ پھیلانے والی کتنی سنسنی ہے اور اس طرح لوگوں کو تبصروں سے بندہ سمجھ جاتا ہے کہ کون حق ہے اور کون دشمن۔" اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا جو بہرحال اپنا وزن رکھتی تھی۔

"تمہارا خیال ہے کہ یہ محض افواہ ہے جو انہوں نے سنسنی کے لیے خود پھیلائی ہے۔؟" میں نے گویا بات ختم کر دینا چاہی۔

"اگر ایسا نہیں تو پھر یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد کیوں نہیں لیتے۔ ان کے گھر والے نمبر پر دھمکیاں ملتی ہیں نا۔ تو اس پر آبزرویشن لگوا دیں۔ پولیس یا پھر کسی دوسرے ادارے کا اپنا ایک تفتیشی طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہ شخص مل جائے گا اور دھمکیاں بند ہو جائیں گے۔ یوں ہی

خواہ مخواہ کا سسٹ کھڑا کیا ہوا ہے۔" اس نے بےزاری سے کہا۔

"خواہ مخواہ تو نہیں ہو سکتا نا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسی بات کرتے ہیں آپ، آپ کو سردرد آج ہے تو آپ علاج کسی اور وقت پر رکھ دیں گے یا پھر اسے نظرانداز کر دیں گے۔ جتنی تکلیف ہوتی ہے بندہ اتنی جلدی علاج کی کوشش کرتا ہے۔" گوندل نے صاف لفظوں میں کہا اور پھر اس موضوع پر بات ہی ختم ہو گئی۔ وہ چلا گیا اور میں اپنے معاملات میں مصروف ہو گیا۔

اگلے دن کی شام ہونے سے تھوڑی دیر قبل زاری بیگم کا فون آ گیا۔ اس وقت میں دفتر سے نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس دن بھی زاری بیگم کا لہجہ کھردرا ہی تھا۔

"میں نے ایک پریس کانفرنس بلائی ہے، آپ آ جائیے گا۔"

"ہمارے اخبار کے شوبز کو تو بلایا ہے نا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، ابھی گوندل صاحب سے بات ہوئی ہے، وہ آ رہے ہیں۔ لیکن آپ تو ضرور آئیں نا۔" وہ تیزی سے بولی۔

"موضوع کیا ہے پریس کانفرنس کا۔ مطلب کیا بات ہو گی؟" میں نے یونہی تجسس سے عادتاً پوچھ لیا۔

"وہی ٹیلی فون والی دھمکیاں، آج تو ہمارے دفتر والے فون پر مجھے دھمکیاں ملی ہیں۔" اس نے ذرا سی حیرت اور غصے ملے جذبات میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب آپ کھل کر سامنے آ جانا چاہتی ہیں۔" میں نے کریدنا چاہا تو وہ ایک دم سے محتاط ہوتے ہوئے بولی۔

"اب یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ خیر! آپ آ ہی رہے ہیں، باقی باتیں یہیں ہو جائیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا۔ بلاشبہ اسے دوسرے لوگوں کو بھی فون کرنا تھا۔ اس لیے میں نے فون رکھ دیا۔ میں نے انہی لمحوں میں سر اٹھا کر دیکھا تو ساجد گوندل کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پایا۔ میرے متوجہ ہوتے ہی وہ بولو۔

"کیا خیال ہے۔ پھر چلیں؟"

"کہاں؟" میں نے تصدیق کر لینا چاہی۔

"زاری بیگم کے گھر، فون میں نے ہی آپ کی طرف ٹرانسفر کیا تھا۔" گوندل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہم اس کے گھر کی جانب نکل گئے۔

وہاں پر شہر کے تقریباً تمام اہم شوبز رپورٹر پہنچے ہوئے تھے۔ ان سب کو دھمکیوں کے بارے میں معلوم تھا۔ اور وہاں پر اسی حوالے سے باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ ان کی قیاس آرائیاں تھیں کہ زاری بیگم آج کس حوالے سے بات کرے گی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے شوہر کے ساتھ باقاعدہ بات چیت شروع کی۔ لمبی چوڑی تمہید کے بعد اس نے یہی کہا کہ مجھے میرے حاسدین کی جانب سے قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں جواب ناقابل برداشت حد تک جا پہنچی ہیں۔ سب سے اہم بات اس نے یہ کی کہ اب وہ باقاعدہ پولیس کے پاس جا رہی ہے۔ اس نے تھانے کا نام بتائے بغیر کہا کہ

ابتدائی رپورٹ لکھوا دی گئی ہے۔ لہٰذا اب پولیس ہی کے ذریعے قانونی کارروائی کی جائے گی۔ سوال و جواب کا سلسلہ تھوڑی دیر تک رہا جو کہ سراسر تکلف ہی تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد صرف جواباً دھمکیاں دینا ہے تاکہ وہ جو کوئی بھی ہے پولیس کے ڈر سے خاموش ہو جائے۔ اس سارے دورانیے میں اس کا شوہر بالکل خاموش رہا تھا۔ اور پھر پریس کانفرنس ختم ہوتے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں اور گوندل بھی وہاں سے آ گئے۔

میرے ذہن میں یہ بات چپک کر رہ گئی تھی کہ آخر یہ دھمکیوں والی بات اتنی لمبی کیوں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا سلسلہ یا تو ختم ہو جانا چاہئے تھا یا پھر اخبار میں تصویر آتے ہی اس کا کوئی نہ کوئی عملی ثبوت دیا جانا ضروری تھا۔ یا پھر کوئی فقط یہی چاہتا تھا کہ زاری بیگم ذہنی پریشانی کا شکار رہے۔ اتنے دنوں تک بات ایک ہی جگہ اڑی ہوئی تھی۔ شاید اس طرح کا خیال گوندل کے ذہن میں بھی تھا۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ بولا۔

"کیا خیال ہے آپ کا، یہ ڈرامہ کچھ زیادہ لمبا نہیں ہو گیا؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اتنے دنوں بعد ان کی جانب سے بھی دھمکی دے دی گئی ہے۔ کیوں نہیں انہوں نے اب تک کوئی کوشش کی۔ پہلے یہ معاملے کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔ اب باقاعدہ رپورٹرز کو بلوا لیا گیا ہے۔ پولیس کی بجائے خود ان کی اپنی رسائی بہت زیادہ ہے۔ کم از کم ٹیلی فون پر آبزرویشن ہی لگوا لیتے۔ اس فون تک پہنچتے جہاں سے کال کی گئی ہے۔ انہوں نے تو کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اگرچہ یہ بات دل کو لگتی ہے، تاہم انہوں نے ایسا ہی کیا ہو اور نمبر پولیس کو دے دیا ہو۔" گوندل نے خیال آرائی کی۔

"تو پھر اتنی تشہیر کی ضرورت کیا ہے۔ چپ چاپ خاموشی سے اس بندے تک پہنچ جائیں اور بات ختم۔" میں نے کہا تو گوندل نے ایک دم سے چونکتے ہوئے کہا۔

"ذرا ایک منٹ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب دیکھا۔ پھر کہتا ہی چلا گیا۔ "اب تک سارے زاری بیگم کی ہمدردی میں ہیں۔ وہ رپورٹرز کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ کیوں نا ہم اس خبر کو اپنے انداز میں دیکھیں۔ اپنی تحقیق کریں۔ نتیجہ جو بھی ہو اسے سامنے لے آئیں۔ زاری بیگم اگر ناراض ہوتی ہے تو بھاڑ میں جائے۔"

"میرے خیال میں تم نے اب عقل مندی کی بات کی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ میرا انداز کیا ہے۔ اس لیے تیزی سے بولا۔

"تو پھر کیوں نا ہم کسی جگہ بیٹھ کر یہ طے کر لیں کہ آخر کرنا کیا ہے۔" گوندل نے خالصتاً صحافیانہ انداز میں کہا تو میں ہنس دیا۔

"کل بات کریں گے۔ تم بھی اس پر سوچنا۔ میں بھی سوچوں گا۔" میں نے کہا اور اپنی راہ لی۔ اگلے دن وہ معمول کی میٹنگ کے بعد میرے پاس آ گیا اور آتے ہی یہی موضوع چھیڑ دیا کہ اس نے کیا سوچا ہے۔

"یقین جانیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جس تھانے میں انہوں نے ایف آئی آر لکھوائی ہے۔ اس کے بارے میں معلوم کیا۔ اور وہاں کوئی بندہ واقف ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور واقفیت ہے وہاں پر۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"پھر خبر لینے کے انداز میں اندر کی بات معلوم کرو۔ خصوصاً اگر زاری بیگم والے تفتیشی سے واقفیت نکل آئے تو۔ اس سے وہ نمبر معلوم کرنے کی کوشش کرو جس سے فون کیا جائے گا۔ یا کیا گیا ہے۔ تبھی ہمارے لیے کوئی رستہ نکل پائے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"نمبر سے۔۔۔۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔! ایک سمت مل جائے گی نا یار۔۔! صرف نمبر چاہیے۔" میں حتمی انداز میں کہا۔

"تو یہ کون سی بات ہے۔ پولیس کو درمیان سے نکالیں۔ میں سیدھے ٹیلی فون والوں سے نمبر لے لوں گا۔ اپنا شہزاد ہے وہاں پر۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ دھمکی دینے والا فون کرے تو۔۔۔۔" وہ آخری فقرے میں بہت مایوسی سے بولا۔

"میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔ اگر ویسا ہوا تو وہ فون بھی کرے گا۔ تب ہم نمبر کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیسا خیال۔۔؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ میں پھر بتاؤں گا۔ پہلے تم اپنا کام کرو۔ اور یہ بھی یقین رکھنا کہ زاری بیگم کے حوالے سے ساری سٹوری تمہارے نام ہی سے ہو گی۔ فکر نہیں کرنا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو ایک دم خوش ہو گیا اور بولا۔

"میں آج ہی جاتا ہوں، شام تک کوئی نہ کوئی بات تو بتا ہی دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چلا گیا۔ تو میں نے اپنی فوٹوگرافر کو فون کر دیا۔

کچھ عرصہ قبل زاری بیگم نے ادھیڑ عمر خواتین کے سنگھار پر ایک ماڈلنگ کی تھی۔ اس کا اہتمام میری فوٹوگرافری نے کیا تھا۔ اس میں اگرچہ زاری بیگم بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، تاہم میں نے اس کی وہ خاص "لک" کو برقرار رکھا تھا کہ وہ سن اسی کی دہائی والے فیشن ہی میں دکھائی دے۔ ساتھ میں جدید بھی تھی۔ لیکن دوسری ماڈلنگ اتنی پڑی ہوئی تھی کہ زاری بیگم کا نمبر نہیں آ رہا تھا۔ یوں ادھیڑ عمر ماڈل ہونے کی بناء پر نظر انداز ہو گئی تھی۔ میں نے وہ ماڈلنگ منگوالی۔ پھر ان میں سے تصاویر منتخب کر کے شائع ہونے کے عمل میں ڈال دیں اور خود اس پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھ دیا۔ تین دن بعد میگزین نے منظر عام پر آنا تھا۔ اس کے بعد ہی کوئی نتیجہ سامنے آنے والا تھا۔ اس دوران گوندل کے ذریعے بہت سارے معلومات ملتی رہیں۔ پولیس نے اپنے طور پر شوبز کے حلقوں میں پوچھ تاچھ کی، لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ انہیں خود اس بات پر حیرت تھی کہ دوبارہ فون ہی نہیں آیا۔ اب انتظار یہی تھا کہ دھمکی والا فون موصول ہو تو وہ اسے پکڑ سکیں۔ تفتیشی آفیسر نے خود گوندل میں دلچسپی لی تھی کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہو چکا تھا۔

تیسرے دن میگزین شائع ہو گیا۔ زاری بیگم کی تصاویر بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں تھیں، ساتھ میں مضمون کی سرخی جمائی تھی کہ میں اداکاری کے نئے پہلو متعارف کراؤں گی۔ حسب معمول گوندل میرے پاس آیا اس نے سرورق اور اندرون صفحات پر ماڈلنگ دیکھی اور پھر اس پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کہا۔

"ان باتوں کو چھوڑو، بلکہ جیسے بھی کہتا ہے کہو آج دھمکی آمیز فون آنے کا بہت قوی امکان ہے۔ اس موقعہ کو ضائع نہ کیا جائے۔"

"آپ کو کیسے یقین ہے؟" اس نے غور سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس ہے نا تم فون کر کے کہہ دو بلکہ زاری بیگم سے بھی کہہ دو کہ وہ ہوشیار رہے اور زیادہ سے زیادہ بات کر کے اس بندے کا لہجہ، گفتگو کا انداز اور ایسی کوئی خاص بات نوٹ کرنے کی کوشش کرے۔ پہلے کی طرح غصہ یا ناراضگی کا اظہار نہ کرے۔ بلکہ اسے سمجھائے اور نہ سمجھنے پر دھمکی دے دے۔" یہ اور اس طرح کی باتیں میں نے گوندل کو سمجھائی۔ اس نے میرے سامنے ہی دو تین فون کر دیئے۔

"پھر وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ مغرب سے ذرا پہلے، میں ابھی دفتر میں تھا کہ گوندل کا مجھے فون ملا۔ وہ خاصا پر جوش تھا۔"

"آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا، زاری بیگم کو فون پر دھمکی ملی ہے۔"

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ میں زاری بیگم کے پاس ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ لیں انہی سے بات کریں۔" پھر ذرا سی دیر میں وہ لائن پر تھی۔ اس کے کھردرے لہجے میں سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے مجھے وہیں اپنے پاس بلا لیا۔ کیونکہ وہیں پولیس آفیسر بھی آ رہا تھا۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ سہولت سے بیٹھنے تک پولیس آفیسر بھی آ گیا۔

"اس بار تو فون پر اس نے بڑی سنگین دھمکیاں دی ہیں کہ اب اگر اخبار میں تصویر تو کیا اداکاری کی بھی خبر شائع ہوئی نا تو وہ اب فون نہیں براہ راست قتل کرنے آ جائے گا۔ یہ آخری وارننگ ہے۔" زاری بیگم نے بتایا۔

"آپ نے اس سے لمبی بات کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کی تھی۔ مجھے تو وہ کوئی نوجوان سا جذباتی لڑکا لگتا ہے۔ اس کا لہجہ اور زبان ٹھیٹ پنجابی تھی۔ بہت غصے میں تھا یوں جیسے گنوار بات کر رہے ہو۔ اس نے میری ایک نہیں سنی، بس اپنی سنائے گیا تھا۔ پھر بند کر دیا۔" وہ بولی۔

"تو اس کا نمبر معلوم ہوا؟" میں نے عام سے انداز میں پولیس آفیسر سے پوچھا تو گوندل فوراً بولا۔

"نمبر بھی معلوم ہو گیا ہے اور علاقہ بھی جہاں سے فون ہوا ہے۔ یہ تو کیمپس کے پبلک بوتھ کا نمبر ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے یہ کوئی طالب علم ہو سکتا ہے یا پھر کوئی بھی۔" میں نے پولیس آفیسر سے پوچھا۔

"ہاں۔ اب یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہو گا۔ اتنے زیادہ سٹوڈنٹس میں سے کسی بندے کو تلاش کرنا، پھر درمیان میں انتظامی امور کی بھی پیچیدگی ہو گی۔ اور پھر ردعمل کا بھی چانس ہے۔" وہ دھیرے سے بولا تو زاری بیگم فوراً بولی۔

"یہ تو وقت طلب مرحلہ ہو گا۔ اس میں وہ اپنا کام دکھا سکتا ہے اگر وہ واقعتاً جذباتی ہے، دیکھیں رسک تو ہے نا، جس طرح اس نے دھمکی دی ہے۔ میں شوبز والوں سے نہیں گھبراتی لیکن اب تو یہ بہت پریشانی والی بات بن گئی ہے۔ مجھے تو اب واقعی سنجیدگی سے اوپر بات کرنا پڑے گی۔" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ کی رپورٹ کے بعد کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"اب یہ تو میرے آفیسر ہی بتا سکتے ہیں نا۔" اس نے بالکل ہی جان چھڑا لی۔ اور پھر چند الوداعی باتوں کے بعد وہ چلا گیا۔ زاری بیگم اوپر

بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ سو ہمارا وہاں بیٹھنا فضول تھا، اس لیے ہم وہاں سے اٹھ گئے۔

اس تھوڑی سی پیش رفت کے بعد یوں ہوا کہ جیسے مزید کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ زاری بیگم کو دوبارہ فون نہیں ملا اور نہ ہی کسی اخبار وغیرہ میں اس کی کوئی تصور آئی۔ کیونکہ زاری بیگم اندر سے بالکل خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے شوبز کی سرگرمیوں میں حصہ لینا بند کر دیا تھا۔ تاہم اندر ہی اندر اس متوقع لڑکے کی تلاش جاری تھی۔ جو کہ خفیہ والے کر رہے تھے۔ میں شاید اس بات کو بھول جاتا مگر گوندل اپنی ہٹ کا پکا نکلا۔ وہ اپنی خبر کے منطقی انجام کے لیے سرگرداں رہا۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی کبھار اس موضوع پر بات کر لی تو کر لی، ورنہ وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا معمول بنا لیا ہوا تھا کہ وہ سٹوڈیو جانے سے قبل نیو کیمپس ضرور جاتا۔ وہاں اس نے اپنے علاقے سے تعلق رکھنے والے طالب علموں سے دوستی کر لی۔ ان کے ساتھ مارکیٹ جاتا اور وہاں سے چائے ضرور پیتا۔ وہیں مارکیٹ کے پبلک بوتھ سے فون وغیرہ کرتا۔ اب اس کے معلومات لینے کا طریقہ کار کیا تھا، اس کا مجھے نہیں علم لیکن تقریباً ایک مہینے بعد اس نے بڑے ہی پرجوش انداز میں مجھے یہ خبر سنائی۔

''وہ زاری بیگم کو دھمکی دینے والا لڑکا، آپ کو یاد ہے نا؟''

''ہاں، یاد ہے، کیا ہوا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔'' گوندل نے انتہائی جوش بھرے لہجے میں دھیرے سے کہا۔

''کیا واقعی؟'' میں یہ سن کر گویا اچھل پڑا۔

''ہاں۔!'' یہ کہہ کر اس نے پوری روداد سنا دی۔

اس کا وہاں جانا تو معمول بن ہی گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی کوشش سے دوسرے لڑکے بھی دوست بن گئے۔ چند شوقین لڑکوں کو وہ سٹوڈیو کی سیر بھی کروا لایا۔ کسی کے ساتھ فلم یا ٹی وی میں کام دلانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ شوبز دنیا کی چھوٹی چھی پس پردہ کہانیاں بھی چلتی رہتیں۔ پھر ایک دن اسے معلوم ہوا کہ فیضان ملک نامی لڑکا ایک اوکاڑہ زاری بیگم سے شدید نفرت کرتا ہے۔ یوں اسے گوہر مقصود ہاتھ لگ گیا۔ ایک ہفتے کی کوشش کے بعد اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ بلاشبہ فیضان ملک ہی وہ لڑکا تھا۔ جس نے زاری بیگم کو دھمکیاں دیں۔

''مگر کیوں دیں اس نے دھمکیاں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ تو بالکل نہیں معلوم ہو سکا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''میں نے بہت کوشش کی لیکن نہیں پتہ نہیں چلا، ہاں اسے شدید نفرت ہے۔''

''نفرت کی کوئی تو وجہ رہی ہوگی میری جان، اس طرح تو تمہاری رپورٹ بالکل پھیکی رہ جائے گی۔'' میں نے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو چیلنج کر ڈالا۔

''اس لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ کیا کروں، اگر وہ لڑکا پکڑا گیا تو میں اپنے علاقے ہی میں نہیں، یہاں بھی طلبہ کی نفرت کا شکار ہو جاؤں گا۔ اور عین ممکن ہے مجھے نقصان بھی پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سارا کریڈٹ پولیس لے جائے گی اور اس لڑکے کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس پر تشدد بھی۔۔۔'' گوندل یوں کہتا چلا گیا۔ جیسے سارے نتائج اس نے پہلے ہی سوچ رکھے ہوں۔ ایسا ہی کچھ میرے دماغ میں بھی چلنے لگا تھا۔

''تو پھر بھول جاؤ اس سارے معاملے کو، اپنی ایک رپورٹ کے لیے کسی کا مستقبل داؤ پر مت لگاؤ۔'' میں نے افسوس سے کہا۔

''لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے'' اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''بولو کیا؟'' میں نے بھی پوری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

''جس قدر اس لڑکے میں زاری بیگم کی خلاف نفرت ہے، اسی قدر ممکن ہے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی دھمکیوں پر عمل کر جائے۔ تب پھر کیا ہوگا؟''

''یہ بھی درست ہے تو پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کوئی اس کا حل سوچو، مجھے اس لڑکے فیضان ملک سے ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ زاری بیگم کو بھول کر اپنی پڑھائی کو ختم کرے اور یہاں سے چلا جائے۔'' گوندل نے خاصا جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیسے میری جان۔ ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ اس کی نفرت کیوں ہے۔ اس سے بات کریں گے تو نجانے اس کا ردعمل کیا ہو۔ خوف زدہ ہو گیا تو بھی غلط ہے۔ چڑ گیا تو بھی ٹھیک نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اس بات کو بھول جانا چاہیے۔'' میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔! آپ سے نہیں پر فیضان ملک سے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ شریف النفس قسم کا۔۔۔''

''پھر تو زیادہ خطرناک بات ہے۔ یہ جو شریف آدمی ہوتے ہیں نا، یا اگر اپنی آئی پر آ جائیں نا تو اتنے دھماکے سے پھٹتے ہیں کہ ہر جانب تباہی ہو جاتی ہے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔

''پھر بھی، کوئی بات، کوئی خیال۔۔۔ کوئی معاملہ، ویسے بھی خفیہ والے کبھی کبھار دکھائی دیتے ہیں، میں مانتا ہوں کہ وہاں ان کے اور بہتیرے کام ہیں لیکن اگر فیضان ان کے ہتھے چڑھ گیا۔۔۔ تو کسی اور کیس میں پھنسا دیں گے۔'' گوندل نے نجانے کیا سوچ رکھا تھا۔

''یار تم تو خوف زدہ ہی کرتے چلے جا رہے ہو۔ کوئی خوش گمانی والا پہلو سوچو، چلو خیر، کچھ سوچیں گے۔'' میں نے واقعتاً اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد گوندل چلا گیا لیکن میرے دل میں کھد بد شروع ہو گئی۔ گوندل کے دل میں اگر فیضان ملک کے لیے کوئی نرم گوشہ ہے تو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی۔ ویسے اگر ہماری کوششوں سے دونوں زندگیوں کو لاحق خطرات کم ہو جائیں تو یہ کوشش کر لینی چاہیے۔ اور پھر۔! ایک صحافی کا تجسس بھی تو اہمیت رکھتا ہے جو اپنے طور پر بہت بڑی دلیل ہے۔ میں اگر نہ بھی چاہتا تو میرا دماغ ادھر ہی گھومتا رہتا تھا۔

اگلے دن تک میرے دماغ میں ایک مہم کا خیال آ ہی گیا۔ میں نے اس پر پوری توجہ سے سوچا تو وہ مزید نکھر کر واضح ہو گیا، یہاں تک کہ وہ روشن ہو کر ایک منصوبے کی صورت اختیار کر گیا۔ تاہم اس میں جہاں کامیابی کے بہت زیادہ امکانات تھے، وہاں کسی بھی غیر متوقع ردعمل کی صورت میں ناکامی بھی اتنی شدت سے ہونا تھی۔ میں نے گوندل کو بلایا اور اس سے بات کی۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔

''بس ٹھیک ہے۔ کامیابی، ناکامی ایک طرف، ہماری نیت ٹھیک ہے۔ اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ یہ میرا یقین ہے۔'' گوندل نے پورے جذبے سے کہا تو پھر ہم نے طے کر لیا۔ پھر دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے کہ ہمیں کب اور کیا کرنا ہے۔ یہاں تک کہ مطمئن ہو گئے۔

تیسرے دن کی شام میں زاری بیگم کے ساتھ اس کی کار میں نکلا۔ ہماری منزل سٹوڈیو تھی۔ جہاں اس نے مجھے چند لوگوں

سے ملوانا تھا۔ اس کے پاس تھوڑی دیر کے لیے وقت تھا۔ کیونکہ ایک لمبے عرصے تک دھمکیاں نہ ملنے کے باعث اس نے ایک سیریل کی شوٹنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ پریس والوں سے دور رہے۔ سیریل مکمل ہو جانے تک، اس حوالے سے کوئی تصویر یا خبر کہیں پر بھی شائع نہ ہو۔ ممکن ہے ان دنوں میں، وہ دھمکیاں دینے والا اس کے سامنے آ جائے یا پکڑا جائے، تاہم سیریل تو مکمل ہو ہی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔ انہی باتوں کے دوران جب وہ میری مطلوبہ جگہ کی کالونی سے گذرنے لگی تو میں نے چند منٹ کا کہہ کر گاڑی اس جانب موڑنے کا کہا۔ اس نے گاڑی موڑ دی۔

''آپ جائیں اور جلدی سے آ جائیں۔'' زاری بیگم نے دھیرے سے کہا۔

''اچھا نہیں لگتا ہے آپ یوں سڑک پر کھڑی رہیں آپ بھی آ جائیں پلیز۔ وقت کا کوئی اندازہ تو نہیں ہوتا۔'' میں نے لجالت سے کہا تو وہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئی اور پھر میرے ساتھ اندر آنے کے لیے گیٹ کراس کر لیا۔

وہ میرے ایک بہت قریبی دوست کا گھر تھا جو ان دنوں خالی تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت گوندل کے ساتھ، فیضان ملک وہیں موجود تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے تو سامنے ہی صوفے پر گوندل کے ساتھ فیضان ملک ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اونچا لمبا قد، بھرپور جوان رعنا، چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی والا بڑے ڈیل ڈول کا تھا۔ زاری بیگم پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نازک ترین مرحلہ تھا۔ جس کے لیے گوندل پوری طرح تیار تھا۔ ممکن ہے وہ اسے ذہنی طور پر تیار کر چکا ہو۔ اس لیے وہ نفرت اُبلتی نگاہوں سے ہماری جانب دیکھتا رہا۔ جبکہ زاری بیگم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ سامنے بیٹھا ہوا وجیہ لڑکا کون ہے۔

''گوندل صاحب آپ یہاں؟'' زاری بیگم نے چہکتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔! آئیے بیٹھیں۔ تشریف رکھیں۔'' گوندل نے کہا تو وہ بے نیازی سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی۔ میں بھی بڑے محتاط انداز میں ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی غیر متوقع خطرے کے پیش نظر بندوبست کے بارے میں پوچھ لیا تو اس نے اثبات میں اشارہ دے دیا۔ تب میں نے زاری بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ کو میں یہاں اس لڑکے فیضان ملک سے ملوانے کے لیے لایا ہوں۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے عام سے انداز میں پوچھا، پھر فیضان ملک کی جانب دیکھا جس کی نگاہوں میں سے نفرت ابل رہی تھی۔

''اس لیے کہ یہی وہ لڑکا ہے، جو آپ کو فون پر دھمکیاں دیتا رہا ہے۔'' میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ زاری بیگم ایک دم سے خوف کے ساتھ پیلی ہو گئی۔ اس کی نگاہوں میں وحشت پھیل گئی اور سارا اطمینان کافور ہو گیا۔

''تک۔۔ تک۔۔۔ کیوں۔۔۔ آپ کو ایسا نہیں۔۔۔ کرنا چاہیے۔ مجھے کچھ ہو گیا نا تو آپ اس کے ذمے دار ہوں گے۔۔۔ سب کو معلوم ہے کہ میں آپ کے ساتھ۔۔۔۔'' اس کی آواز میں لکنت کے ساتھ لرزش بھی تھی۔ تب گوندل نے سنجیدگی سے کہا۔

''حوصلہ رکھیں زاری بیگم۔! یہاں آپ کو کسی قسم کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ فیضان ملک بڑا سمجھدار اور خاندانی آدمی ہے۔ یہ میرے ساتھ

وعدہ کر چکا ہے اور یہ وعدہ نبھائے گا بھی۔ خیر۔! آپ دونوں کو اس طرح بغیر بتائے ملانا اگرچہ غیر اخلاقی عمل ہے اور ایک بڑا رسک بھی لیکن اس میں کوئی برائی بھی نہیں، بلکہ بھلائی ہے۔"

"کیا بھلائی ہو سکتی ہے جو دشمن قتل کی دھمکیاں۔۔۔" زاری بیگم نے تھوڑا حوصلہ پکڑتے ہوئے پوچھا تو میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہی بات پوچھنے کے لیے کہ آخر فیضان ایسا کیوں کر رہا ہے اور آئندہ کبھی ایسا نہ کرے۔" یہ کہہ کر میں نے فیضان ملک کی جانب دیکھا اور پھر پوچھا۔ "کیوں فیضان، آپ ان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں کہ فون پر دھمکیاں تک دے ڈالیں۔" میرے پوچھنے پر اس نے پہلے زاری بیگم کی طرف نفرت سے دیکھا اور پھر میری جانب دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

"مجھے اس عورت سے کوئی نفرت نہیں، لیکن اس کی اداکاری سے نفرت ہے۔ یہاں تک کہ مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں، گوندل بھائی کو پتہ ہے۔ میرا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ قتل ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں، اب اگر اس کی کہیں کوئی تصویر دکھائی دی، تو میں واقعتاً اسے قتل کر دیتا۔" اس نے گھمبیر لہجے میں اپنا مدعا کہہ دیا۔

"دیکھیں فیضان۔! آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو، اس کی وجہ جو بھی ہو۔ لیکن آپ کا مستقبل تو داؤ پر لگ جائے گا نا۔ ہم نے بہت سوچ کر اتنا بڑا رسک لیا ہے۔ اگر یہ اداکاری کرتی ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے۔ دوسرے کئی اداکاری کر رہے ہیں۔" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"گوندل صاحب سے اس موضوع پر بڑی بات ہو چکی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ وجہ ضرور جاننا چاہیں گے۔ لیکن۔۔ جو وجہ ہے وہ اتنی مقدس ہے کہ میں اس طوائف کے سامنے کہتے ہوئے بھی توہین محسوس کرتا ہوں۔" اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے، آپ کی وجہ اتنی مضبوط ہو کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہو جائیں۔ یا یہ اداکاری چھوڑ دیں۔ میرے بھائی کوئی نتیجہ تو نکلے۔" میرے یوں کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ اس نے آہستہ سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں حد درجہ محتاط ہو گیا۔ زاری بیگم بھی تن گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پرس تھا۔ اس نے اسے کھولا پھر اس میں سے ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے اسے پکڑا تو اس نے کہا۔

"دیکھیں۔! یہ تصویر دیکھیں۔"

میں نے اس تصویر کو دیکھا تو حیرت کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ زاری بیگم سے مشابہ ایک خاتون کی تصویر تھی۔ جس کے کاندھے پر فیضان نے سر رکھا ہوا تھا۔ وہ کسی بڑی تصویر میں سے کاٹی گئی ہوئی تھی۔ تبھی میرے منہ سے نکلا۔۔ "یہ تو۔۔ زاری بیگم۔۔۔"

"نہیں۔۔۔!" وہ چیخ اٹھا "نہیں۔ یہ اس کی نہیں ہے۔ یہ میری والدہ کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس کی شباہت اس عورت سے ملتی ہے۔ جب میں اسے طوائف کے روپ میں دیکھتا ہوں نا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ یہ منظر عام پر نہ آئے تو میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" فیضان نے یوں کہا جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت دکھ ہو رہا ہو۔ میں نے تصویر زاری بیگم کے سامنے کر دی تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے تصویر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے فیضان ملک کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے تھے۔

"مجھ میں تم اپنی ماں دیکھتے ہو۔" زاری بیگم نے یوں تڑپتے ہوئے کہا جیسے اس پر حیرت ٹوٹ پڑی ہو۔

"ہاں۔! تم میں مجھے اپنی والدہ کی شبیہہ دکھائی دیتی ہے۔ جو میرے لیے بہت مقدس ہے۔" فیضان نے نرم لہجے میں کہا۔

"بیٹا۔! آج کے بعد تم مجھے کبھی اداکاری کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ اس لیے نہیں کہ میں خوف زدہ ہوں بلکہ اس لیے کہ میری شبیہہ کسی ایسی ماں سے بھی ملتی ہے جسے کوئی بہت مقدس جانتا ہے۔" یہ کہہ اس نے بھیک مانگنے والے انداز میں کہا۔ "بیٹا۔ ایک بار فقط ایک بار تم مجھے اپنی ماں جیسی کہہ دو۔ پھر چاہے مجھے گولی مار دینا۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فیضان کی جانب دیکھا۔

"ہاں۔! یہ حقیقت ہے کہ تم میری ماں جیسی ہو۔" وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولا تو زاری بیگم بلک بلک کر رو پڑی۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی یہاں تک کہ فیضان ملک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ کافی دیر بعد زاری بیگم کو ڈھارس ملی تو ہم بھی اٹھ گئے۔ اگلے دن زاری بیگم نے شوبز کی دنیا سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔

چاند، گگن اور چاندنی

چاند، گگن اور چاندنی آپ کی پسندیدہ مصنفہ اقراء صغیر احمد کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے ہمارے معاشرے کی کئی فرسودہ روایات کے ہولناک انجام کی طرف توجہ دلائی ہے، جس میں ایک نہایت جہالت انگیز اور افسوسناک روایت بیٹی کی پیدائش کو باعث شرم سمجھنا اور انہیں بیٹوں کے مقابلے میں کمتر مخلوق سمجھنا ہے۔ حالانکہ اسلام نے زمانہ جہالت کی اس روایت کا سختی سے خاتمہ کیا لیکن ابھی تک ہمارے معاشرے میں یہ روایت نہ صرف موجود ہے بلکہ اس پر عمل کرتا لوگ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ دوسرا اتنا ہی افسوسناک رواج نسل در نسل بدلہ لینے کی روایت ہے۔ ہمارے قبائلی اور پنجاب کے کچھ علاقوں میں تو یہ روایت اتنی شدت سے پائی جاتی ہے کہ خاندان کے خاندان اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس کا انجام محض تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس ناول کے دو کردار شہباز خان اور شمشیر خان اسی روایتی مردانگی کے علمبردار ہیں جو عورتوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور ان پر ظلم وستم کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ورشا آفریدی ایک بہادر لڑکی ہے جو اپنے خاندان کی اس روایت کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اور پھر اُسے کیسے کیسے جہنم زار سے گزرنا پڑتا ہے یہ جاننے کے لئے پڑھیے "چاند گگن اور چاندنی"۔ ہمیں امید ہے کہ اقراء صغیر کے مداح اس ناول کو پسند کریں گے۔ "چاند، گگن اور چاندنی" کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **ناول** سیکشن کے معاشرتی رومانی ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہار

پہلی نگاہ میں وہ زری انگریز لگتی تھی۔ بوٹا قد، گوری سیندوری رنگت، سیاہ گھنیری پلکوں والی نیلی آنکھیں، گہری بھوری زلفوں میں کئی رنگوں کی تہیں تھیں۔ جس میں سیاہ، بھورا اور بادامی رنگ نمایاں تھا۔ گھنگھریالی زلفیں یوں دکھائی دے رہی تھیں کہ جیسے وہ شانہ سے نا آشنا ہوں اور ابھی ان میں سے پانی ٹپک پڑے گا۔ بھرے بھرے سرخ گال جیسے پورا چہرہ بنا دینے کے بعد کچھ زائد مٹی سے گال بنائے گئے ہوں۔ ستواں ناک، جس میں ہلکی سی سونے کی تار تھی۔ سرخ لب جس میں لکیریں واضح دکھائی دیتی تھیں۔ لمبی گردن میں نجانے کتنی طرح کے الول جلول ہار پہنے ہوئے تھی۔ موتیوں کے، سونے کے، پتھر کے، لمبے اور چھوٹے ہار جو اس کے کھلے گریبان والی قمیض میں کچھ اندر تھے اور کچھ باہر۔ سیاہ پاکستانی لباس میں وہ حقیقت میں دمک رہی تھی۔ اس کی لانبی مخروطی انگلیوں میں مختلف طرز کی انگوٹھیاں تھیں۔ ویسی ہی جیسے گلے میں موجود مختلف طرز کے ہار۔ وہ راحیلہ یاسر تھی۔ پاکستان نژاد برطانوی لڑکی جس کا تقریباً ایک ماہ پہلے فون مجھے ملا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کون تھی، کس مقصد کے لیے ملنا چاہتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا۔ اس نے یونہی بتایا تھا کہ وہ چند ہفتوں میں پاکستان آ رہی ہے۔ یہاں آ کر وہ مجھے کال کرے گی، پھر طے شدہ مقام پر ملیں گے۔ سو میں لاہور کے مہنگے ہوٹل میں اس کا مہمان بنا بیٹھا تھا۔ میں اس کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ کوئی بوڑھے یا پھر ادھیڑ عمر کے بزرگ نما انسان ہوں گے، اتنی تجربہ کاری تو وقت کے ساتھ آتی ہے نا۔ جب کوئی پختہ کار ہو جائے تو عمر کھپ جاتی ہے۔ مگر آپ تو اس کے برعکس نکلے۔ مجھے بہت اچھا لگا آپ کو دیکھ کر، جوان، بھرپور مرد اور بہترین شخصیت کے مالک۔۔۔"

"تعریف کرنے کا شکریہ۔۔۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور دل ہی دل میں اس کی رواں اور شستہ اردو کی تعریف کی۔

"بلاشبہ آپ کے دل میں ہو گا کہ میں آپ سے کیوں ملنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑا سا اس کا پس منظر بیان کروں۔ مگر اس سے پہلے کیا میں ویٹر کو آرڈر نہ کروں؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"جی بالکل۔" میں نے کہا اور اس نے ویٹر کو آرڈر کر دیا۔ پھر روئے سخن میری طرف کر کے بولی۔

"میرے بابا کا تعلق لاہور ہی سے ہے لیکن وہ برطانیہ ہی میں مقیم ہیں اور وہیں سرجن ڈاکٹر ہیں۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ وہیں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ہمارے بابا نے ہم سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا، سوائے اس کے ہم اردو بولیں، پڑھیں اور لکھیں۔ سو ہم دونوں بہن بھائی اردو اہل زبان کی طرح بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم نے جہاں اور بہت کچھ پڑھا، وہاں ناول بھی بہت پڑھے۔ تقریباً دو برس قبل ہم دوستوں نے ایک پروڈکشن ہاؤس بنایا ہے۔ جس میں فلم اور ٹی وی ڈرامے بنائے جائیں گے۔ ہم برصغیر کے اردو لکھاریوں سے کہانیاں

لے رہے ہیں۔اس کے بعد ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کہانی پر فلم بنائیں اور کس پر ٹی وی ڈرامہ اور کس ملک کے لیے۔خیر۔!میں آپ کے سارے ناول پڑھ چکی ہوں۔میں آپ سے کہانی خریدنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔اب آپ کے سامنے ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے تمہید کے ساتھ ملاقات کا مقصد بھی بیان کر دیا۔

"آپ کیسی کہانیاں چاہ رہی ہیں۔" میں آہستگی سے پوچھا۔

"ایسی منفرد کہانیاں جو ایک دم سے چونکا دیں۔محبت بھری رومانی کہانیاں، جن میں نیا پن ہو۔انسانی رویوں کے نئے پہلو جن میں بیان ہوں۔" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"دیکھیں یہ کسی بھی لکھاری کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ہو سکتا ہے جو آپ کو نیا پن لگے، وہ نہ لکھاری کے لیے نیا ہو اور نہ ہی ناظرین کے لیے۔اسی طرح لکھاری جیسے منفرد کہہ رہا ہو وہ آپ کے نزدیک منفرد نہ ہو۔نیا انسانی رویہ آپ کے لیے کچھ اور میرے نزدیک کچھ دوسرا ہو سکتا ہے۔عالمی سطح کی کوئی تحریر یکساں حیثیت نہیں رکھتی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا جو اپنی روشن آنکھیں مجھ پر گاڑے ہوئے تھی۔میری بات ختم ہوتے ہی وہ حرکت میں آئی اور تیزی سے بولی۔

"لیکن پھر بھی کوئی چیز۔جس میں انفرادیت ہو۔۔۔میرے پاس اپنا ذاتی معیار ہے۔جیسے میں بیان نہیں کر سکتی۔میں اسی معیار کی کہانیوں کی تلاش میں ہوں۔آپ، نامور اور کہنہ مشق لکھاری ہیں۔آپ کوشش کریں۔" اس کے کہنے کا انداز یوں تھا کہ جیسے وہ مجھے چیلنج کر رہی ہو۔اور میری صلاحیتوں کو آزمانے کے درپے ہو۔اور پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس نے رقم دے کر چیز خریدنی ہے۔وہ چیز کی پوری طرح جانچ پڑتال کر کے ہی خریدے گا۔سو میں نے بھی اسے کھل کر جواب دینا زیادہ بہتر سمجھا۔

"یہاں پر دو باتیں ہیں۔ایک کہانی سے متعلق اور دوسری آپ لوگوں کے رویے کے بارے میں۔"

"بولیں۔!بلکہ ضرور کہیں۔۔" اس نے اپنی آنکھوں میں تجسس سمیٹتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔پھر میز پر کہنیاں ٹکا کر قدرے جھک گئیں تاکہ میری بات کو بڑے غور سے سن سکے۔ایسا کرنے سے اس کی گردن میں پڑے اول جلول ہار ایک دم سے جھنجھنا اٹھے۔تبھی میری نگاہ ان ہاروں پر جا پڑی۔یہ ایک اضطراری کیفیت تھی جس سے میری نگاہ تو پڑی لیکن وہاں کی جزئیات کو میں نے نہیں دیکھا۔میرا ذہن اس کے جواب کے لیے لفظ ترتیب دے رہا تھا۔

"یہ جو فلموں اور ڈراموں وغیرہ کی کہانیاں ہوتی ہیں نا۔۔ان میں کمرشل پہلو زیادہ دیکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ وہ تمام لوازمات جو فلم یا ڈرامے کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔انہیں بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔جس ماحول کی کہانی کی آپ بات کر رہی ہیں۔اس میں نیا پن، اسی ماحول ہی سے لیا جائے گا نا۔مثلاً میرے پاس صحرائی علاقے کی روایتی کہانی میں نیا پن ڈالا جا سکتا ہے۔۔۔ایسا ہی بہت کچھ ہے۔میری بات سمجھ رہی ہیں نا آپ۔۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا جو ساکت وصامت انداز میں میری بات سن رہی تھی۔ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرے کہے ہوئے لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں۔تبھی اس میں حرکت ہوئی اور اس نے دھیرے سے کہا۔

"جی، میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں۔ اس کا جواب میں بعد میں دیتی ہوں۔ آپ اپنی دوسری بات کریں۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ شوبز والے اسی طرح خیال جمع کر لیتے ہیں۔ اور پھر کسی نوآموز لکھاری سے اپنے مطلب کی "شے" لکھوا لیتے ہیں، بہت کم رقم میں۔۔۔ بعض اوقات تو آموز لکھاریوں کی تحریر کو اپنے نام سے استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک طرف سے سنے گئے خیال کو دوسری جانب استعمال کر لیا۔ آپ جانتی ہیں کہ یہاں "خیال" ہی کی قیمت ہوتی ہے۔" میں نے یہ کہہ کر اس پر واضح کر دیا کہ لکھاریوں کو لوٹنے کا چلن کیا ہے۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ آپ کی پہلی بات کو بعد میں زیر بحث لاتے ہیں۔ یہاں فی الحال میں واضح کر دوں کہ آپ اپنی کہانی سنائیں اور اس کا معاوضہ مجھے طے کرنے کی اجازت دیں۔ میں ایک ہفتہ یہاں پر ہوں۔ آپ اپنے خیال سناتے جائیں اور ان کا فوری معاوضہ لیتے جائیں۔ جو کہانی میرے معیار پر پوری اتری، اس پر آپ اپنی مرضی کا معاوضہ مانگنے کے مجاز ہوں گے۔ یعنی کہانی لکھنے سے پہلے ہی آپ اس کی قیمت لے لیں۔ کیا کہتے ہیں آپ؟" اس نے بڑی خوبصورتی سے بال میرے کورٹ میں پھینک دی۔ تب مجھے تذبذب میں کہتے ہوئے بنی۔

"مجھے منظور ہے۔"

"گڈ۔ اجہاں تک آپ کی پہلی بات ہے، اس کے ضمن میں عرض کروں کہ جو آپ کو اچھا لگتا ہے، جس ماحول کی جیسی بھی کہانی آپ کے ذہن میں ہے، مجھے سنائیں۔ جو اچھی لگی اس پر معاہدہ طے کر لیں گے۔ ورنہ آپ کو اپنی کہانی کا معاوضہ تو مل ہی جائے گا۔" اس نے سادہ سے انداز میں کہا تو میں مطمئن ہو گیا۔ اس دوران ویٹر ہمارے درمیان کافی اور اس کے لوازمات رکھ گیا۔ کافی پینے کے دوران یہ طے پا گیا کہ وہ ایک دن میں کسی بھی وقت، کہیں بھی ملاقات طے ہو جایا کرے گی۔ وہیں کہانی سنا دی جائے گی اور وہیں معاوضہ دے دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کے پروڈکشن ہاؤس، برصغیر کے اردو لکھاریوں اور مختلف تحریروں پر بات ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

ہماری دوسری ملاقات ایک بنگلے میں ہوئی۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھایا ہی تھا کہ وہ چند لمحوں ہی میں وہاں آ گئی۔ اس نے بلیک شارٹس اور سلیولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زلفیں کس کر باندھی ہوئی تھیں، جس سے اس کا ماتھا چوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بار گردن میں ہاروں کا بوجھ نہیں تھا بلکہ سفید موتیوں کا چھوٹا سا ہار تھا جو عموماً یورپی خواتین پہنتی ہیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں نیلے رنگ کے پتھر والی ایک انگشتری تھی۔ پاؤں میں ایسے سلیپر نما جوتے تھے جیسے دو سیاہ خرگوش اس نے اپنے پیروں میں باندھے ہوئے ہوں۔ شارٹس اور سلیپروں کے درمیان سفید پنڈلیاں دمکتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، جس پر شوق کے دیے روشن تھے۔ اس نے اوپری دانت سے نچلے ہونٹ کو دبایا ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور اپنی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں، جن میں تجسس پوری طرح عیاں تھا۔

"جی، تو کیا آپ مجھے کہانی سنا رہے ہیں؟" اس نے یوں پوچھا کہ جیسے شاید میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔

"بالکل۔ کیا آپ سننے کے لیے تیار ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی، میں بے تاب ہوں۔" اس نے کہا اور پھر آنکھوں سمیت کھل کر مسکرا دی۔ تب میں اسے کہانی سنانے لگا۔ وہ ایک لڑکے کی کہانی تھی۔ جس طرح زیادہ مٹھاس کڑواہٹ کا باعث بن جاتی ہے، اسی طرح زیادہ محبت اس کے لیے اکتاہٹ بن گئی تھی۔ اسے ایک چہرہ دکھائی دینے

لگا، جو پھر بعد میں مجسم ہو کر نظر آنے لگا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ ایک ہی ایک لڑکی، یعنی اس جیسا چہرہ رکھنے والی لڑکی کہیں دوسرے شہر میں بس رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ لڑکا اس چہرے میں ڈوب جاتا ہے۔ جبکہ وہ لڑکی، اس لڑکی کی آس میں ہو جاتی ہے۔ وہ پورے انہماک سے میری کہانی سنتی رہی۔ درمیان میں اس نے مجھے قطعاً ڈسٹرب نہیں کیا۔ بلکہ پوری توجہ سے مجھے یوں سنتی رہی جیسے ایک ایک لفظ اپنے اندر اتار رہی ہو۔ اس دوران کھانے پینے کے لوازمات بھی چلتے رہے۔ یوں تقریباً ایک گھنٹے بعد میری کہانی مکمل ہوئی، جسے سننے کے بعد وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر قریب پڑا اپنا پرس اٹھایا۔ اس میں سے بڑے پونڈوں کی ایک گڈی نکالی۔ اس میں سے کافی سارے نوٹ گنے، الگ کیئے، گڈی واپس رکھی اور نوٹ اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر پیش کرنے والے انداز میں بولی۔ ”یہ آپ کی اس کہانی کا معاوضہ۔۔۔ کہانی اچھی تھی لیکن سوری، مجھے یہ کہانی اپنے معیار پر اترتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔“

اگرچہ وہ رقم میری اب تک کی کہانیوں کا سب سے زیادہ معاوضہ تھا، مگر وہ معاوضہ ہاتھوں میں آتے ہی مجھے عجیب سا لگا۔ جیسے کسی ضرورت مند کی فقط ضرورت پوری کی جائے۔ مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا۔ مرا دل تو کیا کہ یہ نوٹ اسے واپس کر دوں اور کہوں کہ جب میری کہانی پسند آئے تو میں اس کا معاوضہ اپنی مرضی سے لے لوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں ان خیالات کا اظہار کرتا۔ وہ اٹھ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اجازت طلب کر رہی ہوں۔ میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا بلکہ باہر کی جانب لپکتا چلا گیا۔

ہماری تیسری ملاقات ایک فارم ہاؤس پر ہوئی۔ میں شہر کے ایک خاص مقام تک آیا، جہاں سے راحیلہ کی بھجوائی ہوئی گاڑی نے مجھے وہاں تک پہنچا دیا تھا۔ میں راستے میں سوچتا چلا آیا تھا کہ یہ راحیلہ، اس کا خمیر اگرچہ مشرق ہی سے اٹھا ہے، والدین مشرقی ہیں مگر یہ تو ذہنی طور پر وہی انگریز ہے۔ اسی ماحول میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اس کے پہننے اوڑھنے اور بات کرنے میں اسی ماحول کا اظہار ہے۔ اس کی سوچ بھی مغربی ہے۔ جبکہ کہانیوں میں مشرق پوری طرح ہمکتا ہے۔ ممکن ہے میری کہانی، اس کے معیار پر اس لیے نہ اتری ہو۔ بہرحال میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی خواہش پر کہانیاں سناؤں گا۔ ایک تجربہ ہی سہی۔ گاڑی پورچ میں رکی تو ایک آیا نما ملازمہ اپنی معیت میں مجھے چھت تک لے گئی۔ جہاں فابری کرسیوں میں ایک پر راحیلہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نیلی جینز پر سفید ڈھیلا ڈھالا کاٹن کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس میں سے اس کی گلابی بدن ہی پوری طرح عیاں نہیں ہو رہا تھا بلکہ اندرونی پیراہن کا سیاہ رنگ بھی پوری طرح واضح ہو کر اپنی بناوٹ کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے اپنی زلفیں اکٹھی کر کے پونی میں باندھی ہوئیں تھیں۔ اس نے ہلکے سے سفید سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ جو اس نے ایک دوسری کرسی پر رکھے ہوئے تھے اور مجھے دیکھتے ہی سمیٹ لیئے۔ اس نے زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر حال احوال کے تمہیدی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ماحول بہت شاندار تھا۔ چھت پر سے اردگرد کے سبز منظر بہت خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ اپنے سامنے اور اردگرد کے دلکش نظاروں کو دیکھ کر میں ویسے ہی سرشار ہو گیا۔

”جی، تو پھر سنایئے اپنی نئی کہانی۔۔۔“ اس نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ تب میں نے چند لمحات میں اپنے خیالات کو مجتمع کیا اور پھر کہانی سنانے لگا۔ یہ ایک لے پالک لڑکی کی کہانی تھی۔ جسے اپنے والدین کا علم نہیں تھا۔ مگر جس کے پاس وہ رہ رہی تھی، اس کے رشتے دار اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ لڑکی اپنی ذات کے سراغ میں اپنے والدین کو تلاش کرنا چاہتی ہے اور یہی کمزوری ان کے ہاتھ آ جاتی ہے۔ میں کہانی سناتا رہا

اور اس کے چہرے کے تاثرات کو بھی دیکھتا رہا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ جیسے کوئی منظر کو دیکھ رہا ہو مگر اس پر سوچ نہ رہا ہو۔ کیونکہ میری ساری توجہ اپنی کہانی کے تار و پود، الفاظ کی نشست و برخاست اور جملوں کی بندش پر تھی۔ ہمیں کسی نے بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ کوئی چھت پر نہیں آیا۔ میں کہانی سناتا رہا اور راحیلہ پوری توجہ سے سنتی رہی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب کہانی مکمل ہوئی تو اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کہانی بہت اچھی ہے، کسی بھی کمرشل فلم کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے اسے۔ لیکن سوری سر۔! یہ کہانی میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔''

میرے جذبات پر اچانک ہی اوس پڑ گئی۔ اس کہانی کا خیال اگرچہ میرے ذہن میں بہت پہلے ہی سے تھا لیکن اس کا خلاصہ میں نے بہت محنت سے پوری رات لگا کر بنایا تھا۔ اس نے اپنا پرس نکالا سفید لفافے میں موجود پاؤنڈ نکال کر دیکھے اور پھر وہ لفافہ مجھے دے دیا۔

''گن لیں۔ یہ پہلی کہانی سے زیادہ معاوضہ ہے۔''

نجانے کیوں مجھے یہ لفافہ پکڑتے ہوئے خوشی نہیں بلکہ شرمندگی کے احساس نے جکڑ لیا۔ میں وہاں سے جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت کہا کہ میں لنچ کے لیے رک جاؤں۔ مگر میں اندر سے مطمئن نہیں تھا اس وقت دو طرح کے جذبات مجھ پر حاوی تھے۔ ایک کہانی کی ناپسندیدگی کا دکھ اور دوسرا اگلی کہانی کی بنت میں پوری قوت لگا دینے کا جذبہ۔ وہ سوچ تک میرے ساتھ آئی۔ میں بہت اچھے انداز میں اس سے رخصت ہوا۔ وہاں سے نکلتے ہی نئی کہانی کی بنت کے لیے خیالات کو اپنے قبضہ قدرت میں کرنے کی سعی کرنے لگا۔ ڈرائیور نے مجھے فارم ہاؤس سے شہر کے اسی مقام تک چھوڑ دیا، جہاں اسے میں نے کہا۔

ہماری چوتھی ملاقات مصنوعی جھیل والے پارک کے پرسکون گوشے میں ہوئی۔ وہ دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں دو کرسیاں تھیں اور درمیان میں میز دھرا ہوا تھا۔ راحیلہ کی بھیجی ہوئی گاڑی ہی مجھے وہاں تک لائی تھی۔ وہ ایک کرسی پر براجمان میری طرف پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس بار راحیلہ کی زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہلکے پیازی رنگ کا پاکستانی لباس پہنا ہوا تھا، جس پر گہرے میرون رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول تھے۔ اس کا لباس خاصا تنگ تھا۔ جسم کے سارے خطوط کھل کر اپنا اظہار کر رہے تھے۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ، اس نے اپنے گلے میں سونے کی موٹی سی تین چینز پہنی ہوئی تھیں۔ ایک موٹی جو گلے کے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ درمیانی اس کے سینے سے ذرا اوپر تک اور تیسری پتلی جو سینے سے ذرا نیچے تک لٹک رہی تھی۔ لمبے لمبے سونے کے جھمکے اور پیروں میں سیاہ لیدر کے سلیپر کے ساتھ سونے کی پائل پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایک لمحے کو سینے کی نیلی رگوں نے متوجہ کیا۔ تاہم میرا دھیان اپنی کہانی کی طرف تھا جو میں نے اسے سنانا تھی۔ میز پر کھانے پینے کے لوازمات پہلے ہی سجے ہوئے تھے، جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''لیں کچھ۔۔۔!''

''نہیں، بہت شکریہ۔ آپ کہانی سنیں۔'' باوجود کوشش کے میں اپنی بے تابی نہ چھپا سکا۔ تبھی وہ سیدھا ہوئی پوری طرح متوجہ ہو کر بولی۔

''جی ضرور۔! سنائیں۔''

میں نے کہانی شروع کر دی۔ میرے تئیں وہ بہت منفرد کہانی تھی۔ اس میں عورت کے ان نازک جذبات کا بیان تھا۔ جو پیار کی پہلی ملاقاتوں میں اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور پھر کوئی انہی جذبات کو استعمال کر لیتا ہے۔ میں جتنے جذب سے وہ کہانی سناتا رہا۔ وہ اتنے ہی شوق و انہماک سے سنتی رہی۔ اس بار مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کہانی اس کے معیار پر پورا اترے گی۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کی نچوڑ کہانی اسے سنا دی تھی۔ میری کہانی ختم ہوئی تو اس نے جذبے سے عاری چہرے کے ساتھ کافی دیر تک مجھے دیکھا۔ پھر بنا کہے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا۔ بنا گنے ہی اس نے کافی سارے پاؤنڈ اپنے ہاتھ میں لیے اور میری جانب بڑھا دیئے۔ میں نے پکڑ لیے تو وہ بولی۔

''مجھے افسوس ہے سر۔! آپ کی یہ کہانی بھی مجھے متاثر نہ کر سکی۔ میرے معیار پر نہیں اتری۔ بہر حال آپ کا معاوضہ پیش ہے۔''

میں ایک دم سے چکرا گیا۔ دل چاہا کہ یہ معاوضہ اس کے منہ پر دے ماروں اور آئندہ کے لیے نہ ملنے کا کہہ کر اٹھ جاؤں۔ یہ میرے اندر کے انا پرست شخص کے جذبات تھے۔ لیکن ایک قلم مزدور لکھاری کے لیے ایسا رویہ دکھانا، اس کے لیے زہر قاتل ہو سکتا تھا۔ پھر اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ کیا میں عاجز ہو گیا ہوں۔ میرے پاس مزید کوئی کہانی نہیں ہے؟ کیا میں اس بات کا اعتراف کر لوں کہ میں اس کے چیلنج کے سامنے ہار گیا ہوں۔ باوجود کوشش کے میں اپنے اندر کے جذبات کا اظہار نہ کر سکا۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اجازت ...؟''

''دو دن بعد میں نے واپس چلے جانا ہے۔ اور ہماری فقط ایک ہی ملاقات ہو پائے گی۔ یعنی کل میں آپ کی آخری کہانی سنوں گی۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے انتہائی اختصار سے کہا۔

''اوکے۔!''

میں اس کار کی جانب بڑھ گیا جو مجھے یہاں تک لائی تھی اور اب مجھے اس نے واپس چھوڑ دینا تھا۔

اگلے دن میری پانچویں اور آخری ملاقات ایک معروف پروڈکشن ہاؤس کے آفس میں ہوئی۔ وہ چند لوگوں میں گھری ہوئی تھی اور ان سے کاروباری باتوں میں مصروف تھی۔ اس نے میرا گرم جوشی سے استقبال کیا، ہاتھ ملایا اور پھر مجھے ایک طرف صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ سیاہ کوٹ پتلون اور سفید شرٹ کے ساتھ بالکل ایک کاروباری خاتون دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی باتوں کا انداز بھی سیدھا سادھا کاروباری تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کافی سارے معاہدے کر چکی ہے۔ کچھ کے ساتھ ابھی تذبذب میں ہے اور کسی کو صاف جواب دے چکی ہے۔ یہاں تک کہ ہم آفس میں تین لوگ رہ گئے۔ تیسرا شخص اس پروڈکشن فرم کا مالک تھا۔ راحیلہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بن کچھ کہے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ہم اب صرف دونوں تھے۔ وہ اٹھی اور میرے قریب صوفے پر آن بیٹھی۔ اتنے قریب کہ اس کے لباس پر لگی پرفیوم کی مہک نے ایک خاص خوشگوار تاثر دے دیا۔

''جی فرمائیں۔! میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر اپنے گلے میں پہنی ہوئی سفید قیمتی موتیوں کی مالا کو انگلی سے سہلایا۔

"کیا آپ مصروف ہیں؟" میں اضطراری کیفیت میں پوچھا تو دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔نہیں تو۔۔۔ میں صرف اور صرف آپ کے لیے یہاں ہوں۔آپ جب تک یہاں اس کمرے میں ہیں، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔سوائے آفس بوائے کے۔۔۔وہ کچھ کھانے پینے کو تو لائے گا ہی۔۔"

"تو پھر سناؤں کہانی۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"جی۔" اس نے کہا اور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔اس بار جو میں نے اسے کہانی سنائی ،وہ ان حالات کے بارے میں تھی جو کسی بھی انسان کی شخصیت بنانے یا بگاڑ دیتے ہیں۔اور اس میں انفرادیت یہ تھی کہ ان حالات میں وہ کون سے گھناؤنے یا پاکیزہ لمحات ہوتے ہیں، جن کے تاثرات بہت دور تک جاتے ہیں۔لمحاتی فیصلوں کے دور رس اثرات پر مبنی کہانی میں روایتی کردار تھے جو ہماری تمام زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔وہی تقریباً ایک گھنٹہ تھا۔درمیان میں دو بار کافی کے ساتھ لوازمات بھی آئے۔میں کہانی سنا چکا تو اس نے اپنے پرس کو سیدھا کیا اور پاؤنڈوں کی اچھی خاصی تعداد نکالتے ہوئے بولی۔

"سوری سر جی۔اس بار بھی آپ کی کہانی معیار کو نہیں چھو سکی۔"

میں اس کے یوں کہنے پر ایک دم سے بھنا گیا۔مجھے لگا کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر فقط مجھے زچ کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔شاید وہ اپنے کسی جذبے کی تسکین کی خاطر اس طرح کا رویہ اپنائے ہوئے تھی۔یا پھر گھٹیا لوگوں کی طرح ذہنی اذیت دے کر اندر کے تخلیقی انسان پر کاری ضرب لگانے کی ذلیل کوشش تھی۔تاکہ تخلیقی انسان اپنے زخموں کو سہلاتا ہوا ذہنی اذیت کا شکار ہو جائے۔جس سے وہ احساس کمتری اور اپنے بانجھ پن کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔تبھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے اب تک دیئے ہوئے سارے پونڈ نکالے اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے معیار پر پورا نہیں اتر سکا۔یہ اپنی رقم اپنے پاس رکھیں۔"

"نہیں۔۔نہیں۔۔۔۔سر۔۔۔یہ آپ کے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مزید رقم ان پر رکھ کر مجھے دینا چاہے مگر میں نے نہیں لیے۔وہیں پڑے رہنے دیئے تو وہ بولی۔"یہ آپکا معاوضہ ہے۔آپ کا خیال میں نے سنا تو۔۔۔"

"نہیں۔!آپ اس کے عوض فقط ایک بات بتا دیں۔" میں دھیمے لہجے میں کہا

"پوچھیں۔!" وہ اشتیاق سے بولی۔

"آپ کا معیار کیا ہے، ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"ہاں۔!میں آپ کو ایک چھوٹی سے کہانی سناتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"جی بالکل۔!میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے بھی اسی کے لفظ استعمال کیئے۔اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔تب اس نے پوچھا۔

"کیا آپ عورت کی اس صلاحیت سے واقف ہیں کہ وہ مرد کی آنکھ میں اس کی نیت دیکھ لیتی ہے۔"

"جی، مجھے معلوم ہے۔" میں نے دھیمے سے کہا۔

''تو بس پھر اسی کو ذہن میں رکھے گا۔اب میں آپ کو کہانی سناتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔پھر کہتی چلی گئی۔''میں نے بہت پڑھا بلکہ بے تحاشا اردو فکشن پڑھا۔ مجھے پڑھنے میں یہاں تک مہارت ہو گئی کہ لکھنے والے کی شخصیت مجھ پر واضح ہو جاتی تھی۔میرے اپنے ذہن میں ہر عورت کی طرح ایک رومانوی شخص کا ہیولا ہے۔جو مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔وہ اتنا رومانوی ہے کہ میں اس کی محبت کی پھوار میں اس قدر بھیگ جاتی ہوں کہ بے بس ہو جاتی ہوں۔وہ شخص میں نے آپ کی کہانیوں میں دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں اپنے رومانوی شخص تک پہنچ گئی ہوں۔میں نے اس کا زندہ وجود پالیا ہے۔یہاں تک کہ میں آپ سے ملی۔یہ سچ ہے کہ میں ایک پروڈکشن ہاؤس کی مالک ہوں۔ مجھے اچھی کہانیوں کی تلاش ہے۔آپ کی یہ ساری کہانیاں اچھی ہیں اور میں ان کا معاہدہ آپ سے ابھی کروں گی لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا۔۔۔؟''میں نے تیزی سے پوچھا۔

''آپ کی کہانیوں میں جس قدر رومانس ہے، جذبات نگاری میں انوکھا پن ہے، سراپا نگاری میں کمال ہے، محبت کے احساس کی اتھاہ گہرائیاں ہیں، خوبصورت ترین اور بے خود کر دینے والے جذبات کی کارفرمائیاں پوری لطافت کے ساتھ آپ کی تحریروں میں ہے۔۔معاف کیجئے گا۔۔وہ آپ میں نہیں ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گلے میں پڑے ننھے موتیوں کے ہار کو پھر لاشعوری طور پر انگلیوں سے چھوا۔

''آپ کو اس سے کیا، آپ کو کہانی چاہیے تھی۔مصنف کی شخصیت جیسی بھی ہو۔''میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''نہیں، میں آپ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔میں نے آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعے بہت چاہا تھا۔ان دنوں کہانی سننے کے دوران میں نے آپ کا ہر لحہ جائزہ لیا۔عورت کی نگاہ مرد کی آنکھ میں اس کی نیت تک پڑھ لیتی ہے۔سو آپ بہترین رومانوی لکھاری ہیں۔مگر رومانوی انسان نہیں۔۔۔''

اس نے بے چینی میں کہا اور صوفے سے اٹھ کر میز کے عقب میں پڑی کرسی پر جا بیٹھی۔اس کا چہرہ اور آنکھیں میرے لیے اجنبی ہو گئیں تھیں۔میں اٹھا اور آفس سے باہر نکلتا چلا گیا۔اس کے اعتراف نے میرے اندر کے تخلیقی انسان کو بچا لیا تھا۔جس پر میں خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔تاہم میرے اندر ایک سوچ بڑی شدت سے سوال بن گئی تھی کہ میں ہار گیا ہوں یا وہ ہار گئی ہے؟

❁❁❁

(ختم شد)